تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اردو

اقبال عظیم کی غزلیات کا موضوعاتی مطالعہ

محقق:

روبینہ شاد

225FLL/MSURDU/F19

نگران:

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو

شعبہ اردو (خواتین)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

سنبل

Accession No 1425428

MS
891.4391
روا

اردو ادب ۔ شاعری ۔ موضوعاتی مطالعہ

بسم الله الرحمن الرحيم

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **RUBINA SHAD**

Title of the Thesis: اقبال عظیم کی غزلیات کا موضوعاتی مطالعہ

Registration No: **225-FLL/MSURD/F19**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Kamran Abbas Kazmi
Chairperson
Department of Urdu
Islamabad

External Examiner:

Dr, Aqlima Naz
Assistant Professor
Fatima Jinnah Women University,
Rawalpindi

Internal Examiner:

Dr. Shiraz Fazal Dad
Assistant Professor
Department of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:

Dr. Humaira Ishfaq
Assistant Professor
Department of Urdu, IIUI
Islamabad

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ روبینہ شاد رجسٹریشن نمبر 225-FLL/MSURDU/F19 نے ایم۔ایس۔ اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"اقبال عظیم کی غزلیات کا موضوعاتی مطالعہ"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

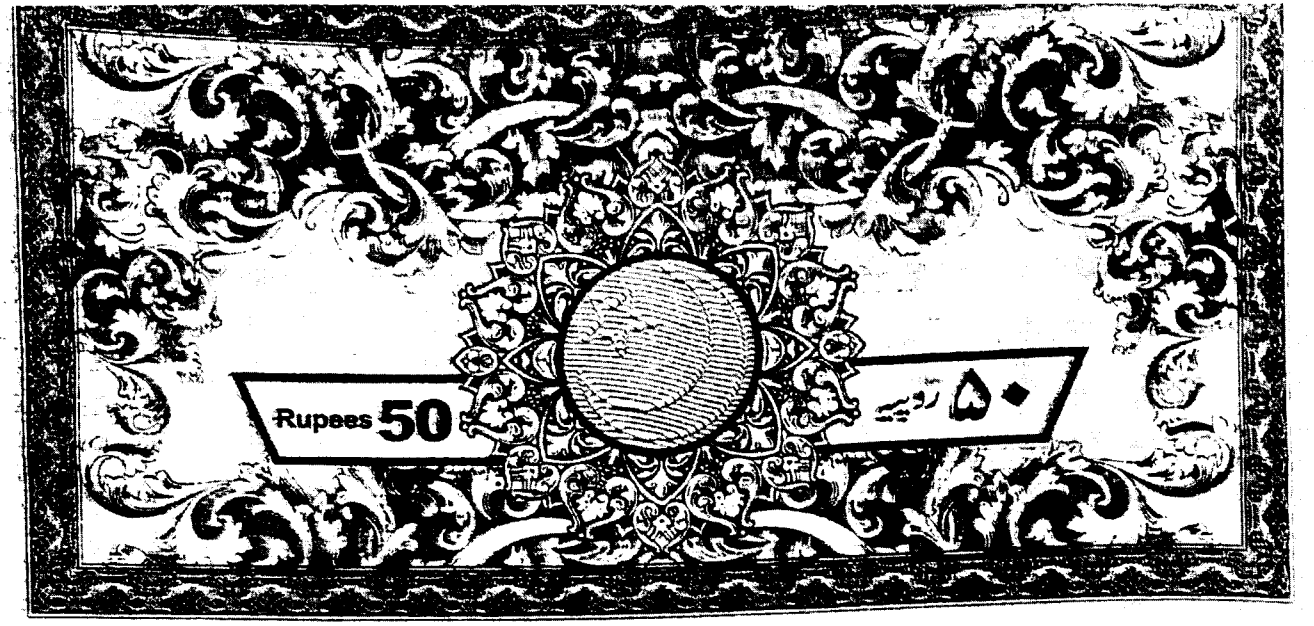

بیان حلفی

منکہ مسماۃ روبینہ شاد دختر لیاقت علی شاد رجسٹریشن نمبر 225-FLL/MSURDU/F19 شعبہ اردو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں برائے ایم ایس اردو کی سکالر ہونے کی حیثیت سے اپنا مقالہ بعنوان **اقبال عظیم کی غزلیات کا موضوعاتی مطالعہ** نگران استاد ڈاکٹر حمیرا اشفاق مکمل کیا ہے۔

مسماۃ روبینہ شاد دختر لیاقت علی شاد اس بات کا حلفاً اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ ہذا ہر قسم کے سرقہ سے پاک ہے مسماۃ روبینہ شاد نے مقالہ ہذا کو کسی اور ڈگری کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ پیش کروں گی ان تمام حقائق کا اقرار کرتی ہوں کہ میں نے کوئی امر مخفی نہیں رکھا لہٰذا غلط بیانی کی صورت میں ہر قسم کی ذمہ داری مسماۃ مذکورہ پر عائد ہوگی۔

بیان بالا میرے علم و یقین کے مطابق صحیح و درست ہے اور کوئی امر پوشیدہ نہ رکھا گیا ہے۔ بیان بالا من حلف نے پڑھ، سن و سمجھ کر درست تسلیم کیا اور بطور قبولیت اپنے دستخط کر دیئے تا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

الحلف _____

روبینہ شاد دختر لیاقت علی شاد

رجسٹریشن نمبر 225-FLL/MSURDU/F19

حامل شناختی کارڈ نمبر 61101-4581412-2

شعبہ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

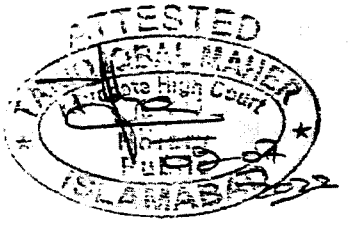

انتساب

اپنے والد گرامی لیاقت علی شاد اور والدہ محترمہ عابدہ بی بی کے نام جن کی دعاؤں اور ریاضتوں کے طفیل مجھے

یہ مقام حاصل ہوا

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	**باب اوّل:**	
	اقبالؔ عظیم کی غزلوں میں تصورِ محبت	۱
	حوالہ جات	۲۳
۲۔	**باب دوم:**	
	اقبالؔ عظیم کی غزلوں میں تصورِ غم	۲۷
	حوالہ جات	۶۵
۳۔	**باب سوم:**	
	اقبالؔ عظیم کی غزلوں میں سیاسی و سماجی شعور	۷۱
	حوالہ جات	۱۱۷
۴۔	**باب چہارم:**	
	اقبال عظیم کی غزلوں میں خودداری ور جائیت	۱۲۴
	حوالہ جات	۱۶۴
	ماحصل	۱۷۱
	کتابیات	۱۸۱
	ضمیمہ جات	

پیش لفظ

جہدِ مسلسل اور حصولِ علم کی سچی لگن ہی ایک طالبِ علم کو صحیح معنوں میں طالبِ علم بناتی ہے۔ ہمہ وقت کچھ نیا جاننے اور تلاش کرنے کی دھن اسے تحقیق و جستجو پر اکساتی اور راغب کرتی ہے۔ میرا یہ تحقیقی مقالہ بھی اسی جذبے کے مرہونِ منت ہے۔

تحقیقی مقالہ تحریر کرنے سے پہلے کسی بھی محقق کے لیے اس کے موضوع کا انتخاب کرنا ایک بہت بڑا چیلنج ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اگر موضوع اہمیت کا حامل نہ ہو یا اس میں طالبِ علم کی دلچسپی نہ ہو تو وہ دورانِ تحقیق انصاف سے کام نہیں لے سکتا۔ مجھے بھی موضوع کا انتخاب کرتے ہوئے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی مرتبہ مختلف موضوعات پر انتہائی محنت سے تحقیقی خاکے بھی تیار کیے مگر عدم دلچسپی کے سبب ان کی بنیاد پر تحقیقی کام مزید آگے نہیں بڑھا سکی۔

یہاں میں اپنی قابلِ قدر استاد ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ کا خصوصی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتی ہوں جنہوں نے مجھے اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے کچھ بہت اچھا اور مختلف کرنے کا مشورہ دیا۔ انہی کی ترغیب پر میں نے انتہائی سوچ بچار کے بعد ڈاکٹر حمیرا اشفاق صاحبہ کی مشاورت سے "**اقبال عظیم کی غزلیات کا موضوعاتی مطالعہ**" کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔

میں اپنی نگران کار اور استادِ محترم ڈاکٹر حمیرا اشفاق صاحبہ کی خدمات کا اعتراف بھی ضروری خیال کرتی ہوں جنہوں نے موضوع کے انتخاب کے سلسلے میں مجھ سے بھرپور تعاون کیا، اپنی رائے مجھ پر مسلط نہیں کی بلکہ مجھے یہ اعتماد بخشا کہ میں اپنی دلچسپی اور صلاحیتوں کے اعتبار سے خود اپنے لیے کسی موضوع کا انتخاب کروں۔ اس لیے کہ بقول ان کے:

"لٹریچر والوں کے فیصلے دماغ سے نہیں، بلکہ دل سے ہوا کرتے ہیں"

اسی شفقت اور اعتماد کا نتیجہ تھا کہ میں نے اپنی ذاتی دلچسپی کی بنا پر ایک ایسے شاعر کی غزلیات کا انتخاب کیا جس پر تحقیقی کام واقعی ضروری تھا۔ اقبال عظیم کی شاعری کے انتخاب کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قارئین میں ان کی فکر اجاگر کر کے ان میں جینے کی امنگ اور آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کیا جا سکے۔

ڈاکٹر حمیرا اشفاق صاحبہ کی نگرانی میں مکمل ہونے والے اس تحقیقی مقالے کے لیے اقبال عظیم کے کلیات غزل "ماحصل" کا انتخاب کیا گیا اور ان کی غزلیات کا مطالعہ فکری و موضوعاتی اعتبار سے کرنے کی کوشش کی گئی۔ مقالے کو پانچ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ باب اول "اقبال عظیم کی غزلوں میں تصورِ محبت" کے عنوان سے ہے جس میں اردو غزل کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے اقبال عظیم کی غزلوں میں بیان ہونے والی محبت کی متنوع کیفیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب دوم بعنوان "اقبال عظیم کی غزلوں میں تصورِ غم" کے عنوان سے ہے۔ اس میں اقبال عظیم کی سوانح اور اشعار کی روشنی میں غم کی نوعیت معلوم کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ باب سوم بعنوان "اقبال عظیم کی غزلوں میں سیاسی و سماجی شعور" تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں اقبال عظیم کی غزلیات میں سیاسی و معاشرتی شعور کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ باب چہارم "اقبال عظیم کی غزلوں میں خودداری و رجائیت" کے عنوان سے ہے۔ اس میں اقبال عظیم کے کلام میں خودداری و رجائیت کے عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باب پنجم "ماحصل" کے عنوان سے ہے۔ اس میں تحقیقی سوالات کی روشنی میں نتائج مرتب کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

تحقیقی مقالے کی تکمیل پر صد ہزار شکر انا اس قادرِ مطلق کے حضور، جس کی رحمت ہمیشہ مجھ نہ چیز پر سایہ فگن رہی، جس نے اندھیرے میں میرے لیے روشنی کی اتنی شمعیں روشن کیں کہ کبھی ظلمت کا احساس ہی نہیں ہوا، جس نے میرے ڈگمگانے سے پہلے مجھے سہارا دیا اور ہمیشہ گرنے سے محفوظ رکھا۔ جس نے میرے لیے رستے کی دشواریوں کو آسانیوں میں تبدیل کیا اور منزل تک رسائی کے ایسے ایسے اسباب مہیا کیے جن کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں بھی ہدیہ تشکر پیش کرتی ہوں، جن کے اس فرمان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش میں میں نے تمام تر اعزازات اور کامیابیاں حاصل کیں کہ:

"معلم بن جاؤ یا متعلم بن جاؤ، اور تیسری حیثیت اختیار نہ کرو"

میں نے آپ ﷺ کے اس فرمان عالی شان کے مطابق دونوں حیثیتوں کو اپنائے رکھا۔ یعنی بحیثیت معلم تدریسی خدمات بھی سرانجام دیتی رہی اور ایک طالبِ علم کی حیثیت سے حصولِ علم کے لیے بھی کوشاں رہی۔ ان دونوں ذمہ داریوں سے بیک وقت عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا۔ ایسے میں حضور نبی مکرم ﷺ کی نسبت نے مجھے ہر موقع پر سنبھالا دیا اور درود پاک کی برکت سے میرے تمام بگڑے کام سنورتے چلے گئے۔

میں اس کرم کے کہاں تھا قابل، حضور ﷺ کی بندہ پروری ہے

تحقیقی مقالے کی تکمیل پر میں اپنے والدین کی تہِ دل سے شکر گزار ہوں، جن کی دعاؤں، ان تھک محنت، بھرپور تعاون اور حوصلہ افزائی سے مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا۔ بالخصوص اپنے والدِ گرامی، لیاقت علی شاد صاحب کی متشکر و ممنون ہوں جن کی شدید خواہش اور پرزور تحریک پر میں نے ایم ایس پروگرام میں داخلہ لیا۔ میں اللہ رب العزت کی شکر گزار ہوں جس نے مجھے اپنے والد کا یہ خواب پورا کرنے کی سعادت بخشی۔ میں اپنے بہن بھائیوں، (بالخصوص چھوٹے بھائی نزاکت علی شاد) احباب اور ان تمام خیر خواہوں کی بھی ممنون ہوں جنہوں نے ہمیشہ میری ہمت بڑھائی اور مجھے کبھی یاسیت کا شکار نہیں ہونے دیا۔

اپنی نگران کار ڈاکٹر حمیرا اشفاق صاحبہ کا بھی صدقِ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے اپنی بے پناہ تدریسی و انتظامی مصروفیات کے باوجود میرے تحقیقی مقالے کی نگرانی کی ذمہ داری قبول کی اور ہر معاملے میں میری معاونت کی۔ میں اپنی ان تمام اساتذہ کرام (ڈاکٹر نجیبہ عارف، ڈاکٹر سعدیہ طاہر، ڈاکٹر فوزیہ جنجوعہ، ڈاکٹر سائرہ بتول، ڈاکٹر شیراز فضل داد اور ڈاکٹر غلام فریدہ) کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے انتہائی محنت اور جاں فشانی سے ہمیں ایم ایس میں پڑھایا، میری مشکلات کو سمجھتے ہوئے ہر ممکن سہولت مہیا کی اور میری شخصیت کی آبیاری میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اساتذہ کرام کے ساتھ ساتھ شعبہ اردو کی انتظامیہ کا بھی بے حد شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے انتظامی امور میں میری رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔

اپنے محسن جناب محبوب ظفر کی بھی خاص طور پر شکر گزار ہوں جن کا دستِ شفقت ہمیشہ میرے سر پر رہا۔ مقالے کی تحقیق کے دوران اقبال عظیم صاحب کی کتب کی دستیابی اور ان کے فرزند تک رسائی انہی کی کوششوں سے ممکن ہوئی۔ استادِ محترم قاسم یعقوب صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے تحقیقی مواد کے حصول میں میری مدد کی۔

میں اقبال عظیم صاحب کے بیٹے شاہین اقبال عظیم، بیٹی تسکین اقبال عظیم اور عزیزہ فرحت پروین ملک صاحبہ کی بھی تہِ دل سے متشکر و ممنون ہوں اور ان کی کاوشوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ جنہوں نے مواد کی فراہمی اور اقبال عظیم صاحب کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے بہت سی مفید معلومات فراہم کیں اور ہمہ وقت مجھ سے بھرپور تعاون جاری رکھا۔

میں اپنی ہم کار ساتھیوں (ڈاکٹر شاہانہ ہمایوں، محترمہ ملکہ رضوانہ، محترمہ قرۃ العین اور صدر شعبہ اردو راولپنڈی وومین یونیورسٹی محترمہ یاسمین اختر صاحبہ کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے نہ صرف مقالے کے لیے تحقیقی مواد کی تلاش میں میری معاونت کی، بلکہ ہر مشکل وقت میں میرا ساتھ نبھایا اور کبھی تنہا نہیں ہونے دیا۔

بہت پیاری سہیلیوں (اقرا عباسی اور انیسہ حبیب) کا بھی بے حد شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے حقِ دوستی ادا کرتے ہوئے مقالے کی پروف ریڈنگ کی اور صدقِ دل سے مختلف کتب خانوں سے کتب اور دیگر صورتوں میں تحقیقی مواد تلاش کرنے میں بھی اپنی خدمات سرانجام دیں۔

اپنی ہم جماعت ساتھیوں (یسریٰ طاہر اور بریرہ ہمدانی) کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے مقالے کی تکمیل میں تکنیکی معاونت فراہم کی۔ بہت عزیز شاگرد اور ہم جماعت عائشہ عنبرین کی ممنون بلکہ مقروض ہوں جنہوں نے انتہائی خلوصِ نیت اور جاں فشانی سے مقالے کی ترتیبات اور حوالہ جات و کتابیات کے اندراج میں میری مدد کی۔

اپنی تمام طالبات (نجمہ فلک، ام حبیبہ، زارا بتول، صبا سدرہ، اسرا لیاقت، اقصیٰ نصیر، مقدس شکیل اور لاریب اشرف) کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری آنکھیں اور دست و بازو بن کر ہر حوالے سے میرے لیے آسانیاں پیدا کیں۔ طالبہ (مریم جاوید اور عنیزہ مصطفیٰ) کا خصوصی شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے سینکڑوں صفحات پر مشتمل کتب کی ریکارڈنگ کی اور انہیں میرے لیے قابلِ رسائی بنایا۔ میں اپنی بھانجی رابیل نوید کی بھی ممنون ہوں جس نے جماعت ہشتم کی طالبہ ہونے کے باوجود کتب اور انٹرنیٹ سے حوالہ جات تلاش کرنے میں ان تھک محنت کی اور میرے لیے اس مشکل کام کو آسان کیا۔

مجھے امیدِ واثق ہے کہ میری اس ادنیٰ سی کاوش سے آنے والے وقت میں طلبہ مستفید ہو کر اپنے علم کی پیاس بجھاتے رہیں گے اور چراغ سے چراغ جلنے کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ میں رب تعالیٰ کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ میرے اس تحقیقی کام کو میرے ساتھ ساتھ میرے والدین، اساتذہ اور ان تمام افراد کے لیے صدقہ جاریہ بنا دے جنہوں نے کسی بھی صورت میں اس کی انجام دہی میں اپنا کردار ادا کیا۔ آمین!

روبینہ شاد

جولائی ۲۰۲۲

باب اول:

اقبال عظیم کی غزلوں میں تصورِ محبت

تحریر و تقریر کے ذریعے انسانی خیالات و افکار اور احساسات و جذبات کا شائستہ اظہار ادب کہلاتا ہے۔ ہر قوم اور علاقے کا اپنا مخصوص ادب ہوتا ہے، جو نہ صرف وہاں پروان چڑھنے والی زبان، تہذیب و ثقافت اور اقدار و روایات کا امین ہوتا ہے بلکہ مستقبل کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور بدلتے رجحانات کا ترجمان بھی ہوتا ہے۔

دنیا کی ہر بڑی زبان کی طرح اردو کا ذخیرۂ ادب بھی دو حصوں میں منقسم ہے۔ نظم اور نثر۔ ہر دور میں ادبا و شعرا اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے مختلف اصنافِ ادب کا سہارا لیتے آئے ہیں۔ کبھی غیر افسانوی نثر اور قصہ کہانی کے توسط سے قارئین کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، تو کبھی شاعری کے وسیلے سے ان کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کو یقینی بنایا جاتا ہے۔

نثر کے مقابلے میں شاعری کی اہمیت اس لیے مسلم ہے کہ سامعین و قارئین پر اس کا اثر فوری اور دیرپا ہوتا ہے۔ اسی طرح دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں غزل کو سب سے زیادہ پذیرائی حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل ہی انسان کے لطیف احساسات و جذبات کی ترجمان ہے اور اسی صنفِ شاعری میں یہ خصوصیت ہے کہ اس میں کم سے کم الفاظ میں بڑی سے بڑی بات کہنے اور اچھوتے سے اچھوتا مضمون با آسانی بیان کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنفِ سخن ہے، جو ابتداً عرب میں پروان چڑھی اور پھر فارسی کے زیرِ اثر اردو ادب میں داخل ہوئی۔ غزل، عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنی "عورتوں سے باتیں کرنا" یا "عورتوں سے متعلق باتیں کرنا" ہیں۔ علاوہ ازیں شکاری کو دیکھ کر ہرن کے حلق سے بوقت خوف نکلنے والی دردناک چیخ کو بھی غزل کا نام دیا جاتا ہے۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں بے پناہ وسعت اور رنگا رنگی پیدا ہوئی ہے۔ اب مذہب، فلسفہ، سیاست، معیشت اور عصرِ حاضر کے مسائل کی ترجمانی بھی غزل کے موضوعات میں شامل ہے۔ تاہم حسن و عشق کا بیان،

وارداتِ قلبی کا پر سوز اظہار، زندگی و سرمستی اور تصوف سے متعلق مضامین کو دیگر تمام موضوعات پر آج بھی فوقیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ کلاسیکی غزل کو فارسی غزل سے ورثے میں ملنے والے موضوعات ہیں۔

غزل کی تاریخ خاصی قدیم ہے۔ ہر دور میں آنے والے شعرا نے فنی و موضوعاتی اعتبار سے اس کی آبیاری میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ اردو غزل کے ابتدائی نمونے ہمیں امیر خسروؔ کے ہاں ملتے ہیں۔ بقول عبد المجید سالک: "خسروؔ کی زبان اس زمانے میں عوام کی زبان بن چکی تھی اور انصاف یہ ہے کہ وہ اردو زبان کے سوا کچھ نہیں۔"[1] دکن میں کتب شاہی، عادل شاہی اور بہمنی شعراء نے غزل کو پروان چڑھایا۔ قلی قطب شاہ اس دور کے نمائندہ شاعر ہیں اور انہیں اردو کا پہلا "صاحبِ دیوان" شاعر بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

جنوبی ہندوستان میں غزل کے باوا آدم کہلائے جانے والے ولیؔ دکنی نے غزل کی بنیادیں از سرِ نو استوار کیں۔ انہوں نے نہ صرف اپنے معاصرین بلکہ بعد میں آنے والے شعرا کو بھی اردو غزل گوئی کی جانب راغب کیا۔ ان کے معاصرین میں سراجؔ اورنگ آبادی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اٹھارویں صدی میں ولی کا دیوان شمالی ہند پہنچا تو اسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ کئی شعرا نے ولی کی پیروی کرتے ہوئے اردو میں شاعری کا آغاز کیا۔ عبادت بریلوی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ولیؔ کی تاریخی اہمیت اردو ادب میں بے پناہ ہے۔ اس نے دہلی کے شاعروں پر اس بات کا انکشاف کیا کہ ان کی مادری زبان میں شاعری کرنے کی بہت زیادہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ اس چیز نے فارسی کے وقار کو کافی نقصان پہنچایا اور اگرچہ قدامت پسندوں کے یہاں فارسی زبان شعری زبان کے طور پر برقرار رہی مگر عوام میں رفتہ رفتہ اس کی مقبولیت کم ہوتی گئی۔ گویا اب اردو کی پزیرائی کا مرحلہ آ پہنچا تھا۔[2]

اسی زمانے میں ایہام گوئی کی تحریک خوب پروان چڑھی اور پھر جلد ہی اس کے خلاف ردِ عمل بھی شروع ہو گیا۔ لہذا یہ تحریک جلد ہی دم توڑ گئی۔ شاہ مبارک آبروؔ، شاکر ناجی، مظہر جانِ جاناںؔ اور شاہ حاتمؔ وغیرہ، کا شمار اس تحریک کے اہم ترین علمبرداروں میں ہوتا ہے۔

اس کے بعد میر و سودا کا دور آتا ہے۔ اسے اردو غزل کا "عہدِ زریں" بھی کہا جاتا ہے۔ رمزیت و داخلیت اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ میرؔ، سوداؔ، دردؔ، میر سوزؔ اور قائمؔ وغیرہ اس دور کے نمائندہ شعرا ہیں دلی میں نادر شاہ کے

حملوں کے سبب قتل وغارت گری بڑھی تو اکثر شعرا ہجرت کر کے لکھنؤ آ گئے۔ یوں لکھنؤ میں اردو غزل کے عبوری دور کا آغاز ہوا۔ مصحفیؔ، جرأتؔ اور انشاؔ اس عہد کے نمائندہ شعرا ہیں۔

لکھنؤ میں غزل کا دوسرا دور "آتش و ناسخ" کے عہد کے نام سے موسوم ہے۔ اس دور کی غزل میں داخلیت کے برعکس خارجیت کا عنصر نمایاں ہے۔ انیسویں صدی میں انگریزوں نے دلی پر قبضہ جما لیا تو اس کا امن اور رونقیں پھر سے بحال ہونے لگیں۔ شعرا بڑی تعداد میں لکھنؤ سے ہجرت کر کے دلی منتقل ہونے لگے۔ غالبؔ اس عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے۔

رفیع الدین ہاشمی غالبؔ کی انفرادیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "غالب اپنے جدت پسند مزاج کے سبب پامال روشوں پر چلنا پسند نہیں کرتے۔ ان کا انداز سب سے منفرد ہے۔"[3] ان کے علاوہ مومنؔ، شاہ نصیرؔ، ذوقؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، شیفتہؔ اور حالیؔ اس عہد کے نمائندہ شعرا ہیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کی وجہ سے دلی ایک بار پھر متاثر ہوئی اور بہت سے شعرا دلی چھوڑ کر نزدیکی ریاستوں میں آباد ہو گئے۔ اس دور میں ریاست رام پور کے نواب نے شعرا کی سرپرستی کی۔ داغؔ اور امیرؔ مینائی اس عہد کے نمائندہ شاعر ہیں۔

ناکام جنگِ آزادی کے نتیجے میں انگریز برسرِ اقتدار آئے تو ملک کی سیاسی و سماجی اور معاشی صورتِ حال پر بہت سے اثرات مرتب ہوئے۔ پرانا تہذیبی ڈھانچہ شکست و ریخت کا شکار ہونے لگا۔ ایسے میں سرسید احمد خان نے اصلاحِ قوم کا فریضہ سرانجام دیا اور اس جدوجہد میں مولانا حالیؔ نے ان کا خوب ساتھ نبھایا۔ حالی نے غزل کی اصلاح کے سلسلے میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے مبالغے سے اجتناب کرتے ہوئے حقیقت پسندانہ شاعری کی ترغیب دی۔ چنانچہ انہیں کی کوششوں سے غزل میں معنوی اعتبار سے وسعت اور فنی اعتبار سے نکھار پیدا ہوا۔ حالیؔ کی اصلاح کے نتیجے میں غزل کی دہری روایت پروان چڑھنا شروع ہوئی۔ چند شعرا مثلاً اصغرؔ، حسرتؔ، یگانہؔ، فانیؔ اور جگرؔ وغیرہ، کلاسیکی روایت کے امین بن کر ابھرے، جب کہ علامہ محمد اقبالؒ نے اردو غزل کو ایک نئے افق سے روشناس کرایا اور اسے فنی و فکری دونوں اعتبار سے جدت عطا کی۔

رومانوی تحریک کے زیرِ اثر غزل کو پروان چڑھانے والے شعرا میں حفیظؔ جالندھری اور اخترؔ شیرانی کے نام نمایاں ہیں، جب کہ فیضؔ، مجازؔ، احمد ندیمؔ قاسمی اور ظہیرؔ کاشمیری وغیرہ نے ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شعرا کی حیثیت سے غزل کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد غزل کو ترقی اور بامِ عروج پر پہنچانے والے غزل گو شعرا میں حفیظؔ ہوشیار پوری، ناصرؔ کاظمی، حبیبؔ جالب، منیرؔ نیازی، اداؔ جعفری، احمد فرازؔ، پروینؔ شاکر، امجد اسلام امجدؔ اور اقبالؔ عظیم وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

عہدِ حاضر کے شعرا میں اقبالؔ عظیم کا نام خاص انفرادیت کا حامل ہے۔ اگرچہ ان کی شہرت و مقبولیت کا زیادہ تر دارومدار ان کی نعت گوئی پر ہے اور اس ضمن میں ان کا مقام و مرتبہ ہر خاص و عام کے یہاں مسلم بھی ہے۔ تاہم غزل گوئی کے حوالے سے ان کی اہمیت اس قدر تسلیم نہیں کی گئی، جس کے وہ مستحق تھے۔ بلاشبہ نعت گوئی دینی و دنیاوی دونوں اعتبار سے ایک بہت بڑا اعزاز ہے اور اقبالؔ عظیم کو اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز عطا بھی کیا ہے۔ مگر ان کی غزل گوئی کو نظر انداز کرنا ان سے زیادتی کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ ان کا فن مسلمہ معیارِ سخن پر پورا اترتا ہے اور ان کی غزلیات کو اردو کی عمدہ غزلوں کے انتخاب میں بآسانی جگہ بھی دی جاسکتی ہے۔

اقبالؔ عظیم نے اپنے شعری سفر کا آغاز گزشتہ صدی کی چوتھی دہائی میں کیا، جو ان کی وفات تک جاری رہا۔ ان کے کلیات میں شامل ڈھائی سو سے زائد غزلیں اس بات کی غماز ہیں کہ وہ نعت کے ساتھ ساتھ غزل کی جانب بھی طبعی میلان رکھتے تھے۔ ان کے تخلیقی اظہار کا اندازہ اسی صورت میں لگایا جاسکتا ہے، جب نعت کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں کا مطالعہ بھی کیا جائے۔ علاوہ ازیں نعت کے تقدس کے پیشِ نظر اس میں شاعر کی شخصیت کے وہ پہلو نہاں رہتے ہیں، جو اس کے نفسی رجحانات و مسائل کے مظہر ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی اقبالؔ عظیم کی غزلیات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اوپر کی سطور میں بیان کیا جاچکا ہے کہ غزل کی صنف فارسی کے توسط سے اردو میں داخل ہوئی لہٰذا آج بھی اردو غزل پر فارسی زبان و ادب کے اثرات نمایاں ہیں۔ عشق و تصوف، درد و غم، سوز و گداز، ہجر و وصال، تغزل، سراپا نگاری، محبوب کا ظلم و ستم، اس کی بے وفائی، اور ناز و ادا یہ سب وہ موضوعات ہیں، جو فارسی کے زیرِ اثر اردو غزل میں شامل ہوئے۔

اقبالؔ عظیم کا شمار بھی ایسے ہی غزل گو شعرا میں ہوتا ہے، جنہوں نے روایت سے اکتساب کرتے ہوئے اپنی غزلوں میں کلاسیکی رنگ ملحوظ رکھا اور روایتی مضامین بیان کیے اور پھر ان میں انفرادی تجربوں سے واقعیت کا رنگ بھر دیا۔ اس ضمن میں اسماعیل احمد مینائی لکھتے ہیں: "ان کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے روایت سے رشتہ نہیں توڑا۔ بلکہ اپنے پیرائے اظہار میں تبدیلی کر کے اسے موجودہ دور سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔"[۴] ذیل کی سطور میں یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ اقبالؔ عظیم نے اپنی غزلوں میں عشق و محبت کی کون کون سی کیفیات بیان کی ہیں۔ اقبالؔ عظیم کی غزلوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی مثلث سے بے حد متاثر ہیں اور شاعری میں جذبہ و تاثیر کے لیے ان اساتذہ ہائے فکر و فن سے اکتساب ضروری خیال کرتے ہیں۔ گویا داخلی اعتبار سے اقبال عظیم کی غزلوں پر میر اور خارجی و بیرونی حوالے سے غالب اور اقبال کے افکار کی گہری چھاپ موجود ہے۔

ناقدین نے اقبالؔ عظیم کی شاعری کو دو ادوار میں منقسم کیا ہے۔ پہلا دور ہندوستان سے مشرقی پاکستان ہجرت تک کے دورانیے پر مشتمل ہے، جبکہ دوسرا دور موجودہ پاکستان ہجرت کرنے سے وفات تک کے عرصے پر محیط ہے۔ دورِ اول کی غزلوں کو ان کی عشقیہ شاعری کا نقطۂ عروج قرار دیا جا سکتا ہے۔ بقول نذیر صدیقی:

> مشرقی پاکستان آنے سے پہلے اگرچہ اقبالؔ عظیم عمر کی درمیانی منزلوں سے گزر رہے تھے پھر بھی اس وقت تک ان کی شاعری عشقیہ ہی تھی۔ ان کی عشقیہ غزلوں میں روایتی موضوعات بھی ہیں، کچھ ذاتی تجربات بھی۔ زمینوں کے انتخاب میں کچھ مشاعروں کا لحاظ بھی ہے اور کچھ اپنی مترنم طبیعت کا تقاضا ہے۔ غزلوں کے اشعار میں سچے معاملات بھی ہیں اور نازک کیفیات بھی۔ محبت زدہ جوانی کی غمگینی بھی ہے اور رومانوی تخیل کی رنگینی بھی۔ افسانۂ محبت کا خلاصہ کم و بیش وہی ہے جو اردو شاعری میں عام طور پر نظر آتا ہے۔[۵]

دورِ ثانی کی غزلیات پر اگرچہ سیاسی و سماجی رنگ غالب ہے تاہم ان میں بھی رومانویت اور تغزل کی چاشنی موجود ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

بارہا اُن سے نہ ملنے کی قسم کھاتا ہوں میں
اور پھر یہ بات قصداً بھول بھی جاتا ہوں میں[۶]

؎ باوجودِ ضبطِ غم، باوصفِ ترکِ گفتگو
کھل ہی جاتے ہیں نگاہوں سے دلوں کے چند راز[۷]

؎ یہ نگاہِ حسن جھکی جھکی، یہ جبینِ ناز دھواں دھواں
میرے بس کی اب نہیں داستاں، مرا کانپتا ہے رُواں رُواں[۸]

؎ ترے مشورے کے خلوص پر، مجھے ترکِ عشق قبول ہے
مگر ایک بات ہے ہم نشیں، مری زندگی کا سوال ہے[۹]

اقبال عظیم کی عشقیہ شاعری میں کیفیت نگاری بھی ہے اور معاملہ بندی بھی۔ نذیر صدیقی کے مطابق کیفیت نگاری میں وہ حسرت اور جگر کے خاندان کے شاعر معلوم ہوتے ہیں اور معاملہ بندی کے اعتبار سے دبستانِ داغ کے شاعر ہیں۔ ان کی معاملہ بندی میں معاملے کا لطف الگ ہے اور زبان کا لطف الگ۔ لیکن اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ معاملہ بندی کے اعتبار سے اقبال عظیم کی شاعری داغ کی شاعری سے مختلف ہے۔ اگر داغ کے ہاں شوخی کا عنصر نمایاں ہے تو اقبال عظیم کے ہاں خودداری کا پہلو ہے۔ مثلاً

؎ اِک شکن ماتھے پہ دیکھی تھی تمہارے ہم نے
پھر کبھی آنکھ اٹھا کر تمہیں دیکھا بھی نہیں

؎ یوں سرِ راہ ملاقات ہوئی ہے اکثر
تم نے دیکھا بھی نہیں، ہم نے پکارا بھی نہیں[۱۰]

؎ ایسی صورت میں بیانِ حالِ دل کا کیا سوال

تم مزاجاً کم سخن اور ہم اصولاً کم سخن[11]

جب ایک عاشق راہِ عشق پر گامزن ہوتا ہے تو اسے قدم قدم پر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان گنت طوفان اس کے مدِ مقابل ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ درد و غم اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ ایک شاعر ان ہی کیفیات کو جب شعر کے لبادے میں بیان کرتا ہے تو اس میں مزید شدت اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ بقول میرؔ:

؎ مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا۔۔۔[12]

درد و غم کا بیان ہر حساس شاعر کی طرح اقبالؔ عظیم کی غزلوں کا بھی بنیادی موضوع ہے۔ انہوں نے خود پر گزرنے والی کیفیات اور قلبی واردات کو غزل کے پیکر میں ڈھال کر اس خوب صورتی سے بیان کیا ہے کہ قاری اس میں اپنے ذاتی تجربے کی کسک محسوس کرنے لگتا ہے۔

سید وقار عظیم اقبالؔ عظیم کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> تم نے کوئی شعر رسماً نہیں کہا اور کوئی شعر اس وقت تک نہیں کہا جب تک کوئی مخصوص خیال، جذبہ یا احساس تمہارے وجود کا مکمل جزو نہ بن گیا ہو اور جب تک اس نے مستقل درد اور کسک کی صورت اختیار نہ کر لی ہو۔[13]

درد و سوز محبت کی خاص عطا ہے۔ اقبالؔ عظیم کی داستانِ حیات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ایک خاتون سے محبت ہوئی تھی مگر یہ تجربہ ناکام رہا۔ ناصر حیات ان کے اس معاشقے کی بابت لکھتے ہیں:

> جوانی کے دنوں میں جب وہ ٹیچرز ٹریننگ کالج لکھنؤ میں پڑھتے تھے تو وہاں پر انہیں ایک کرسچن لڑکی سے عشق ہو گیا۔ لڑکی کے باپ نے ان سے کہا کہ اگر تم مذہب تبدیل کر لو تو تمہاری شادی ہو سکتی ہے۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔[14]

ان کی غزلوں میں سوز و گداز اور درد و غم کی جو کسک محسوس ہوتی ہے وہ غالباً اسی ناکام تجربۂ محبت کی دین ہے۔ اس ضمن میں چند مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

؎ غم تو یوں اور بھی تھے، آپ کے غم سے پہلے

دل کا یہ حال نہ تھا، حسنِ کرم سے پہلے۔۔۔[۱۵]

؎ ترے غم کی یاد گاریں، مرے شعر، میری غزلیں
تری اِک نظر کا حاصل، مرا ذوقِ شاعرانہ۔۔[۱۶]

اقبال عظیم کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ انجامِ محبت سے آگاہ ہونے کے باوجود اس سے خائف نہیں بلکہ اس کا سامنا کرنے کی بھرپور ہمت بھی رکھتے ہیں مثلاً

؎ آغازِ محبت کا، انجام تو ظاہر تھا
ممکن ہی نہ تھی لیکن، انجام سے رُو پوشی[۱۷]

؎ ہم کو معلوم ہے اربابِ وفا کا انجام
ہم جہاں دیدہ ہیں، ہم نے بھی محبت کی ہے[۱۸]

؎ کون ہے جو عشق کے انجام سے واقف نہیں
آدمی اپنی طبیعت سے مگر مجبور ہے[۱۹]

؎ عشق میں اندیشۂ تعزیر کیا؟
سرزنش کیا، قید کیا، زنجیر کیا؟[۲۰]

جب ایک عاشق محبت میں ناکام ہوتا ہے تو اپنی بقیہ تمام زندگی محبوب کی یادوں کے سہارے گزار دینا چاہتا ہے اور اسی میں لذت اور خوشی محسوس کرتا ہے۔ یہی یادیں اس کے لیے سرمایۂ حیات قرار پاتی ہیں۔ اقبال عظیم کی غزلوں کے متعدد اشعار میں اگرچہ ناکامیٔ محبت کا دکھ بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مگر ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ فراقِ محبوب کا ماتم نہیں کرتے بلکہ اس کی یادوں سے راحت و فرحت کا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی اسی کیفیت کے ترجمان ہیں۔

؎ وہ کیا آئے، مری خلوت میں مے خانہ چلا آیا
نظر خوابیدہ خوابیدہ، قدم لغزیدہ لغزیدہ[۲۱]

؎ مرے تصورِ رنگیں میں کوئی یوں آیا
چمن میں جیسے چلی آئے شام مے خانہ[۲۲]

محبوب کا تصور عاشق کو تنہائی پسند بنا دیتا ہے۔ وہ سب میں موجود ہوتے ہوئے بھی سب سے جدا رہتا ہے۔ محبوب کی یادیں اسے دنیا و مافیہا سے بے گانہ کر دیتی ہیں۔ عاشق محبوب کو خود سے الگ نہیں سمجھتا۔ بسا اوقات تو اسے شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا محبوب اس کے بہت قریب ہے اور کوئی اس کے اور اس کے محبوب کے درمیان حائل نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال عظیم بھی فراق میں وصل کی کیفیات سے دوچار رہتے ہیں۔ انہیں ہر لمحہ کبھی محبوب کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے، تو کبھی ساری فضا اسی کی خوشبو سے معطر معلوم ہوتی ہے۔ انہیں یہ گمان رہتا ہے کہ جیسے ان کا محبوب ابھی کچھ دیر پہلے ہی ان سے مل کر جدا ہوا ہے۔ تنہائی میں پروائی اور ہجر میں وصال کی ان کیفیات کو اقبال عظیم نے جابجا اپنے اشعار میں بیان کیا ہے۔ مثلاً

؎ ایک مانوس سی خوشبو ہے فضا میں اب تک
پاس سے اٹھ کے ابھی کوئی گیا ہو جیسے[۲۳]

؎ دل کے بھولے پن پہ خود مجھ کو بھی آتی ہے ہنسی
اِک ذرا آہٹ ہوئی، سجدہ ادا ہونے لگا[۲۴]

محبت میں ایک ایسی کیفیت بھی عاشق پر گزرتی ہے جب اسے محبوب کی بے رخی، بے وفائی اور بے اعتنائی بری معلوم نہیں ہوتی، اس کا ستم کرم لگتا ہے اس کی کج ادائیوں پر محبت کا گمان ہوتا ہے۔ یہاں تک کے اس کے ہاتھوں قتل ہونا بھی کسی سعادت سے کم نہیں لگتا۔ اگر کبھی اس کے ظلم و ستم میں کمی واقع ہونے لگے تو وہ یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہے

کہ کہیں اس کا محبوب اس سے برہم تو نہیں ہو گیا؟ اقبال عظیم کا شعری مزاج اگرچہ مختلف ہے اور ان کے یہاں محبوب کے ستم کو عنایت سے تعبیر کرنے کا رجحان کم ہی ملتا ہے۔ تاہم کہیں نہ کہیں ایسی شعری مثالیں بھی مل جاتی ہیں، جو مذکورہ بالا کیفیات کی ترجمان ہیں۔ مثلاً:

؎ بے رخی کو ان کی سچ مچ بے رخی سمجھا کیا
آج اپنی اس غلط فہمی پہ پچھتاتا ہوں میں[۲۵]

؎ اک ایسے شخص سے بھی راہ و رسم ہے اپنی
جو بے رخی سے ملے، اور اجنبی نہ لگے[۲۶]

راہِ عشق کا مسافر محبوب سے راہ و رسم بڑھانے میں انتہائی احتیاط سے کام لیتا ہے۔ خواہ اس کے دل میں محبوب کی محبت کتنی ہی موجزن ہو، اس خدشے کے پیشِ نظر اظہار نہیں کرتا کہ کہیں وہ اس سے خفا نہ ہو جائے۔ اقبال عظیم کے نزدیک بھی پاسِ ناموسِ محبوب لازم و ملزوم ہے۔ وہ ہر لحظہ اس کی عزت و آبرو کا خیال رکھتے ہیں۔ سربزم یا سرِ راہ نہ تو اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں اور نہ ہی اس سے کوئی بات کرتے ہیں کہ کہیں اس کی رسوائی نہ ہو جائے اور اغیار کو عاشق و معشوق پر انگلیاں اٹھانے کا موقع نہ ملے۔ محبت کی ان کیفیات کو اقبال عظیم نے اپنی غزلیات میں کچھ یوں بیان کیا ہے۔

؎ دیوانے کی یہ بات بڑی بات ہے پیارے
سب پوچھیں ہیں لیکن وہ ترا نام نہ لے ہے[۲۷]

؎ اس بھری محفل میں اپنا مدعا کیسے کہیں
اتنی نازک بات ان سے برملا کیسے کہیں[۲۸]

؎ ناموسِ محبت کا تحفظ ہے بڑی بات
خود اپنا زیاں کوئی بڑی بات نہیں ہے[۲۹]

اقبالؔ عظیم اپنے محبوب کی معصومیت کے دل سے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں محبوب تو بھولا بھالا اور سیدھا سادہ ہے۔ یہ تو اغیار ہیں، جو اسے بے نیازی، بے رخی اور جفا کوشی کا ہنر سکھاتے ہیں۔ ان کے خیال میں رقیب ہی ہے، جو محبوب کو عاشق سے بد ظن کرتا ہے ورنہ محبوب تو اتنا معصوم ہے کہ اسے تو ناراض ہونے کا سلیقہ تک نہیں آتا۔ اپنے درج ذیل اشعار میں وہ محبوب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ تم بظاہر تو بڑے معصوم صورت ہو مگر
سچ بتاؤ یہ ہنر تم کو سکھاتا کون ہے[۳۰]

؎ تمہیں ناراض ہونے کا سلیقہ بھی نہیں آتا
شکن ماتھے پہ ڈالو، اور رو کو اس تبسم کو[۳۱]

بیشتر کلاسیکی و جدید شعراء کی طرح اقبالؔ عظیم کی شاعری میں بھی رقیب کا تصور موجود ہے۔ وہ اس کے لیے "غیر" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اپنی غزلیات میں وہ رقیب کی بجائے محبوب سے شکوہ کناں نظر آتے ہیں کہ وہ غیروں سے تو ہنس ہنس کر بات کرتا ہے مگر عاشق سے انتہائی بے رخی سے پیش آتا ہے۔ اس کے یہ انداز سمجھ سے باہر ہیں۔

؎ غیروں پہ عنایات ہیں، اپنوں سے شکایات
سمجھے نہ کبھی آپ کے انداز کسی نے[۳۲]

ولیؔ ہوں یا میرؔ، غالبؔ ہوں یا اقبالؔ، فیضؔ ہوں یا فرازؔ غرض یہ کہ کلاسیکی شاعر ہو یا عہدِ حاضر کا کوئی سخن ور، ہر ایک نے اپنے اشعار میں محبوب کی سراپا نگاری کی ہے۔ سبھی نے اپنے اپنے انداز میں محبوب کی زلفوں، دراز قامت، چال، آنکھوں، ہونٹوں، اور ان پر سجی مسکراہٹ وغیرہ کی تعریف کی ہے۔ ذیل کی سطور میں کلاسیکی و جدید شعراء کے نمونہ ہائے کلام پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اقبالؔ عظیم کا تصورِ جمال قدما اور معاصر شعرا کے تصورہائے حسن سے کس طرح مختلف ہے؟

؎ ترا لب دیکھ حیواں یاد آوے
ترا مکھ دیکھ کنعاں یاد آوے[۳۳]

(ولیؔ دکنی)

؎ نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے[۳۴]
(میر تقی میرؔ)

؎ ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں[۳۵]
(غالبؔ)

؎ گلوں میں رنگ بھرے باد نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے[۳۶]
(فیضؔ)

اقبالؔ عظیم کی غزلیات میں ایسے اشعار بکثرت ملتے ہیں، جن میں انہوں نے محبوب کی سراپا نگاری کی ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے کہ وہ جمال پرست اور حسن کے رسیا ہیں۔ انہوں نے محبوب کی نگاہوں، چہرے، ہونٹوں، خم دار زلفوں اور چال وغیرہ کی تعریف والہانہ انداز میں کی ہے، مگر اس کے باوجود ان کی شاعری میں بیشتر لکھنوی شعراء کا سا عامیانہ پن اور ابتذال نہیں بلکہ قاری کو ان کی غزل پڑھ کر دل کشی و رعنائی کا احساس ہوتا ہے۔

اس ضمن میں ناصر حیات لکھتے ہیں:

> اقبالؔ عظیم نے بھی اپنے شعروں میں محبوب کا سراپا پیش کیا ہے لیکن ان کے ہاں نہ جرأت کی طرح کا ابتذال ملتا ہے اور نہ نظیرؔ کے جیسی بازاریت ہے بلکہ ان کا محبوب حقیقی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔[۳۷]

اردو ادب کا شاید ہی کوئی ایسا غزل گو ہو گا، جس نے محبوب کی آنکھوں کی تعریف نہ کی ہو۔ اقبال عظیم بھی اپنے محبوب کی نگاہوں کے کمالات کے معترف ہیں۔ ان کے خیال میں محبوب کی نگاہ پر ہی زندگی کا نظام قائم ہے۔ اگر وہ آنکھ کھول دے تو سحر طلوع ہو جائے اور اگر بند کر لے تو ہر سُو ظلمت چھا جائے۔ محبوب نظر اٹھائے تو مے خانے بند ہو جائیں اور جھکا لے تو شیشہ و جام چور چور ہو جائیں۔ وہ نظر سے اس طرح کلام کرتا ہے کہ الفاظ کی حاجت ہی نہیں رہتی۔ یہاں تک کہ اس کی نگاہِ بے نیاز میں ایسا جادو ہے کہ اچھے اچھے اس کی تاب نہیں لا سکتے اور بڑے بڑے پارساؤں کے تقوے تک بہک جاتے ہیں۔ اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ کتنی با مقصد ہے ان کی ہر نگاہِ بے نیاز
دل شکن، پیماں شکن، توبہ شکن، ایماں شکن[۳۸]

؎ نظر جھکی تو ہوا بند بابِ مے خانہ
نظر اٹھی تو ہوئے چور چور شیشہ و جام[۳۹]

اقبال عظیم کو اپنے محبوب کے معصوم و متبسم چہرے سے بھی بے پناہ محبت ہے۔ ان کے نزدیک محبوب کا رخِ روشن سورج سے کہیں زیادہ روشن اور تاب ناک ہے۔ جب وہ اپنے چہرے سے نقاب الٹتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر سُو سیکڑوں آفتاب بکھرے پڑے ہیں۔ اس ضمن میں درج ذیل اشعار دیکھیے

؎ کس نے اپنے روئے روشن سے الٹ دی ہے نقاب
ہر طرف بکھرے پڑے ہیں جیسے صد ہا آفتاب[۴۰]

؎ ترا تبسم معصوم شعر و افسانہ
تری نگاہ غزل، اور غزل بھی رندانہ[۴۱]

اقبال عظیم محبوب کی کافرانہ چال کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر وہ قدم اٹھائے تو وقت کی رفتار بدل جاتی ہے اور رکے تو گردشِ ایام تھمنے لگتی ہے۔ نیز محبوب جدھر جدھر سے گزرتا ہے وہاں پھول کھل اٹھتے ہیں اور ساری فضا معطر

ہو جاتی ہے۔ اقبالؔ عظیم اپنے محبوب کی مسحور کن باتوں، کتابی چہرے، گلابی ہونٹوں، حنائی ہاتھوں، عقابی نظروں سنہری زلفوں غرض ہر جادو بھری ادا کو والہانہ انداز میں سراہتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر محبوب خود آرائی کا اہتمام نہ بھی کرے، تو سادگی میں بھی وہ لاجواب اور بے مثال ہی دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً

؎ کفِ دست نازک، حنائی حنائی، وہ لب ہائے شیریں شہابی شہابی
وہ باتوں میں جادو، اداؤں میں ٹونا، وہ دزدیدہ نظریں عقابی عقابی

؎ نہ ہونٹوں پہ سرخی، نہ آنکھوں میں کاجل، نہ ہاتھوں میں کنگن، نہ پیروں میں پائل
مگر حسنِ سادہ مثالی مثالی، جوابِ شمائل، فقط لا جوابی[۴۲]

اقبالؔ عظیم کی انفرادیت یہ ہے کہ انہیں محبوب کے حسن سے والہانہ عشق تو ہے مگر اس سے حریفانہ کشاکش بھی ہے۔ ان سے پہلے یہ انداز ہمیں یا تو غالبؔ کے یہاں نظر آتا ہے یا پھر یگانہؔ کی شاعری میں۔ غالبؔ ذہنی و طبعی اعتبار سے انفرادیت پسند شاعر تھے۔ ان کے یہاں عشق میں روایتی عاجزی و مسکینی کے بر خلاف ایک جارحانہ انداز پایا جاتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> وہ سوتے ہوئے محبوب کے پاؤں کا بوسہ محض اس لیے نہیں لیتے کہ وہ بدگماں نہ ہو جائے۔ وہ ناراض محبوب کو مناتے بھی نہیں کہ یوں ان کی سبک سری کا پہلو نکل سکتا ہے۔ وہ بزم میں نہیں بلاتا تو یہ راہ میں نہیں ملتے اور جب وہ عجز و نیاز سے رہ پر نہیں آتا تو اس کے دامن کو حریفانہ کھینچنے کی جرات رندانہ بھی کر لیتے ہیں۔[۴۳]

پروفیسر صاحب کے ان خیالات کی وضاحت غالبؔ کے درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

؎ لے تو لوں سوتے میں اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا[۴۴]

؎ عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے[۴۵]

نذیر صدیقی کے مطابق غالبؔ کے مقابلے میں یگانہؔ اور اقبالؔ عظیم کی غزلیات میں حسن کے خلاف جارحیت کا رجحان نمایاں ہے۔ دونوں نے جہاں محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کی ہے وہیں اسے بے معنی اور فانی و ناپائدار بھی قرار دیا ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں

شاید میرا یہ تاثر غلط نہ ہو کہ یہ حریفانہ کشاکش غالبؔ سے زیادہ یگانہؔ اور اقبالؔ عظیم ہی کے یہاں پائی جاتی ہے۔ دونوں نے حسن کو مخاطب کرتے ہوئے جتنے سخت لہجے میں جتنی سخت باتیں کہی ہیں وہ غالبؔ اپنی ساری انانیت کے باوجود نہ کہہ سکے۔[۴۶]

یگانہؔ پر حسنِ صورت کا کوئی اثر نہیں۔ کیونکہ وہ حسنِ صورت کی بجائے حسنِ معنی کے پرستار ہیں۔ یگانہ محبوب کے حسن کو ایک معمہ خیال کرتے ہیں، جس کا سمجھ میں آنا اتنا آسان نہیں۔ اس حوالے سے ان کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎ حسنِ بے تماشا کی، دھوم بھی معمہ ہے
کان بھی ہیں نا محرم، آنکھ بھی ترستی ہے[۴۷]

؎ جب حسنِ بے مثال پر اتنا غرور تھا
آئنہ دیکھنا تمہیں پھر کیا ضرور تھا[۴۸]

یگانہؔ کا اندازِ بیاں کھردرا اور نسبتاً تند و تیز ہے لیکن اس کے برعکس اقبالؔ عظیم کا لب و لہجہ شائستہ اور بات کہنے کا انداز انتہائی دل کش ہے۔ وہ درج ذیل اشعار میں بظاہر تو محبوب سے مخاطب نظر آتے ہیں مگر ان میں پیش کیے گئے خیالات آفاقی سچائی پر مبنی بھی ہیں۔ مثلاً

؎ شکستِ حسن کے منظر بھی ان آنکھوں نے دیکھے ہیں
رخِ افسردہ افسردہ، لبِ لرزیدہ لرزیدہ[۴۹]

؎ تکبر کے سبب اس سے یہ نعمت چھن بھی سکتی ہے
خدا جس شخص کو بھی حسنِ خد و خال دیتا ہے[۵۰]

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب انسان شعور کی منازل طے کر لیتا ہے، تو رفتہ رفتہ اس پر زندگی کی حقیقتیں آشکار ہونے لگتی ہیں۔ یہ احساس شدت سے اس کے دل میں گھر کر لیتا ہے کہ دنیا اور اس میں موجود ہر شے عارضی اور ناپائیدار ہے۔ اقبالؔ عظیم کی غزلوں میں حسن کے ساتھ جو حریفانہ کشاکش نظر آتی ہے، وہ غالباً انھی مذکورہ حقائق کے ادراک کا نتیجہ ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عہدِ شباب میں وہ جس حسنِ ظاہری کے پرستار نظر آتے ہیں پختہ عمری کے دور میں پہنچ کر ان کی سوچ میں ایک واضح تبدیلی رونما ہوتی ہے اور وہ اس سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ محبوب کی کافرانہ چال، خم دار زلفیں، حنائی ہاتھ اور نشیلی آنکھیں انہیں بے معنی اور بے وقعت معلوم ہونے لگتی ہیں۔

؎ وہ صورت پرستی سے اکتا گیا ہے، خلوصِ نظر اور کچھ ڈھونڈتا ہے
نہ موجِ تبسم، نہ دستِ حنائی، نہ مخمور آنکھیں گلابی گلابی[۵۱]

اس دور میں ان کے یہاں محبوب کا تصور یکسر مختلف صورت میں نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک محبوب سادگی کا پیکر، مجسم حیا اور تقدس و پاکیزگی میں مریم کا ہم سر ہے۔ اس حوالے سے یہ شعر ملاحظہ ہو:

؎ کہ نظروں میں اب کوئی شیریں نہیں ہے، جدھر دیکھیے ایک مریم کھڑی ہے
نجابت سراپا، شرافت مجسم، بہ عصمت مزاجی، بہ عفت مآبی[۵۲]

یہاں ان کی شاعری مجاز سے حقیقت کی طرف مراجعت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے دنیا کی حقیقت منکشف ہو جانے کے بعد وہ اس سے کنارہ کش ہو جانا چاہتے ہیں اور محبوبِ حقیقی سے لَو لگا کر اپنے اصل کی طرف لوٹ جانے کے خواہاں ہیں۔

؎ وہ عشقِ مجازی حقیقت میں ڈھل کر، تقدس کی راہوں پہ اب گامزن ہے
جو حسن نگاراں فریبِ نظر تھا، فرشتوں کی صورت ہے گردوں جنابی[۵۳]

تصوف کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو ایسے بہت سے صوفیائے کرام کی مثالیں ہمارے سامنے آتی ہیں، جنہوں نے مجاز سے حقیقت کا سفر طے کیا۔ راقمہ قطعاً اس بات کی دعویٰ دار نہیں کہ اقبالؔ عظیم صوفی شاعر تھے۔ تاہم کہیں نہ کہیں ان کی غزلوں میں متصوفانہ افکار کی جھلک ضرور محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس کی وجہ غالباً وہ متصوفانہ مضامین ہیں، جو عربی و فارسی شاعری کے توسط سے اردو شاعری میں داخل ہوئے۔

آٹھویں صدی عیسویں میں عربوں نے ہندوستان اور ملتان پر قبضہ جمالیا تو اسلامی فکر کو بھی برِ صغیر میں داخلے کی راہ مل گئی۔ مسلم صوفیا دنیا کے مختلف خطوں سے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ انہوں نے ہندو مسلم کے امتیازات سے بالاتر ہو کر ہر خاص و عام کو اسلام کی تبلیغ کی اور بلند تر روحانی زندگی کا پیغام دیا۔ بقول انور سدید: "ان غنی مزاج درویشوں نے دربارِ عام لگائے اور محبت اور خلوص سے دلوں کو مسخّر کیا۔"[۵۴] صوفیائے کرام نے عوامی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا اور سادہ اور عام فہم الفاظ میں پر تاثیر شاعری کی۔ ان عظیم صوفی شعرا میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ، یحییٰ منیریؒ، شمس العشاق میراجیؒ، عبد القدوس گنگوہیؒ، خوب محمد چشتیؒ، مادھو لال حسینؒ، سلطان باہوؒ، بلھے شاہؒ، وارث شاہؒ، سچل سرمستؒ، خواجہ غلام فریدؒ، پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ، خواجہ ناصر عندلیبؒ اور خواجہ میر درد کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اردو کی صوفیانہ شاعری میں خواجہ میر درد کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کی روایت میں انہوں نے پہلی بار صوفیانہ خیالات اور مضامین کو رائج کر کے صوفیانہ شاعری کی روایت کو استوار کیا ہے۔ ڈاکٹر نفیس اقبال فرمان فتح پوری کی بابت لکھتے ہیں:

> دردؔ کا اصل کمال صوفی ہونے میں نہیں بلکہ تصوف کو شعر کا رنگ دینے میں ہے۔ درد اردو کے پہلے صوفی شاعر ہیں اور اردو شاعری میں انہیں کے ہاتھوں تصوف کی بعض صحت مند روایتیں اوّل اوّل داخل ہوئی ہیں۔ اور انہوں نے تصوف جیسے خشک مسئلے کو شعر کا قالب عطا کرنے میں فنکاری سے کام لیا ہے۔[۵۵]

دردؔ کے نظامِ فکر میں شریعت کے اتباع اور قرآن و سنّت کی پیروی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں توحید کا بیان، وحدت الوجود، وحدت الشہود، عشقِ رسول ﷺ، حیات و کائنات، عظمتِ انسان، توکل، اور فنا ان کی شاعری کے اہم ترین موضوعات ہیں۔

اقبالؔ عظیم کی غزلیات میں بھی کہیں کہیں ان موضوعات کا بیان ملتا ہے۔ ان کا دل اپنے خالق و مالک کی محبت سے لبریز ہے۔ وہ بھی ہر عاشقِ صادق کی طرح محبوبِ حقیقی کو ظاہری آنکھ سے دیکھنے کے متمنی ہیں لیکن ساتھ ہی ان خیالات کا پرچار کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ اللہ رب العزت لاکھ پردوں میں بھی بے پردہ ہے۔ لہٰذا اگر انسان کا ذوقِ نظر بیدار اور اس کے باطن کی آنکھ روشن ہو تو نقاب اٹھے یا نہ اٹھے اسے محبوب کا جلوہ دکھائی دیتا ہے اور گفتگو کے لیے کوہِ طُور پر جانے کی حاجت نہیں رہتی۔

ان کے درج ذیل اشعار ان کی اسی سوچ کے عکاس ہیں:

؎ اگر انسان کا ذوقِ نظر بے دار ہو جائے
نقاب اٹھے نہ اٹھے، رُوبرُو دیدار ہو جائے[۵۶]

؎ پردے ہی پردے میں شرحِ آرزو ہوتی رہی
رات ان سے غائبانہ گفتگو ہوتی رہی[۵۷]

آقائے دوجہاں حضرت محمد ﷺ سے عقیدت و محبت کسی بھی مسلمان کے ایمان کا لازمی جزو ہے۔ حبِ رسول ﷺ ہی فلاحِ دارین اور رضائے ایزدی کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں جابجا اپنے پیارے نبی ﷺ کے اوصافِ حمیدہ بیان فرمائے ہیں۔

"اور بے شک آپ ﷺ اخلاق کے بلند ترین درجے پر فائز ہیں۔"[۵۸]

وہ نظم جس میں حضور نبی اکرم ﷺ کی ستائش و ثنا بیان کی جائے، نعت کہلاتی ہے۔ ممتاز حسین نعت کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> میرے نزدیک ہر وہ شعر نعت ہے، جس کا تاثر ہمیں حضور نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی سے قریب لائے۔ جس میں حضور ﷺ کی مدح ہو یا حضور ﷺ سے خطاب کیا جائے۔ صحیح معنوں میں نعت وہ ہے، جس میں محض پیکرِ نبوت ﷺ سے دلی وابستگی پائی جائے۔ جس میں جناب رسالت مآب ﷺ سے محض رسمی عقیدت کا اظہار نہ ہو بلکہ حضور ﷺ کی شخصیت سے ایک قلبی تعلق موجود ہو۔[۵۹]

شعرا نے ہر دور اور ہر زبان میں اپنے اپنے انداز میں آنحضور ﷺ کی شانِ اقدس میں محبتوں اور عقیدتوں کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ نعت گوئی کا باقاعدہ آغاز عہدِ صحابہ میں ہوا۔ حضرت کعب بن مالک، حضرت حسان بن ثابت اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ کا شمار عظیم ثناخوانِ رسول ﷺ میں ہوتا ہے۔ صحابۂ کرام کے علاوہ جن عربی شعرا نے نعت گوئی کی روایت کو بامِ عروج پر پہنچایا، ان میں فرزوق اور ابو عبد اللہ محمد بن زید بحیری کے نام نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ فارسی زبان میں نامور قصیدہ گو اور مثنوی نگاروں نے نعتیہ اشعار کثیر تعداد میں لکھے۔ ان شعرا میں فردوسیؔ، نظامیؔ گنجوی، عرفیؔ اور خاقانیؔ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

عظیم صوفی بزرگانِ دین مثلاً حکیم سنائیؒ، فرید الدین عطارؒ، شیخ فخر الدینؔ عراقیؒ، سعدیؔ شیرازیؒ، مولانا رومیؒ، قدسیؒ، اور نور الدین جامیؒ جیسے شعرا نے عشقِ مصطفیٰ ﷺ میں ڈوب کر شہرہ آفاق نعتیں لکھیں۔

اردو میں نعت گوئی کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ اس زمانے میں مثنویاں لکھنے کا رواج عام تھا۔ لہٰذا ان کی ابتدا احمدیہ اور نعتیہ اشعار سے ہوتی تھی۔ حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کے ہاں ہمیں نعت کے اوّلین نمونے ملتے ہیں۔ قلی قطب شاہ نے بھی نعتیہ اشعار کہے ہیں۔ ولیؔ دکنی، سراجؔ اورنگ آبادی، سوداؔ، میرؔ، خواجہ میر دردؔ، مومنؔ اور غالبؔ کے یہاں بھی کثرت سے نعتیہ اشعار ملتے ہیں۔

اردو میں نعت گوئی کا مقبول ترین دور محسنؔ کاکوروی اور امیرؔ مینائی سے شروع ہوتا ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ دورِ جدید کے اہم نعت گو شاعر ہیں، جن سے اردو میں نعت گوئی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ پرانی غزلوں کو چھوڑ کر ان کی شاعری کا شاید ہی کوئی جزو ہو، جس میں آنحضرت ﷺ کی سیرت اور پیغام کا عکس صاف نظر نہ آتا ہو۔

حالی کی اس روایت کو آگے بڑھانے میں، جن نعت گو شعرا نے اپنا کردار ادا کیا ان میں احمد رضاؔ خان بریلوی، علامہ اقبالؔ، مولانا ظفرؔ علی خاں، بہزادؔ لکھنوی، حفیظؔ جالندھری، ماہرؔ القادری، مظفرؔ وارثی، ریاضؔ مجید اور حفیظ تائبؔ وغیرہ کے نام خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

اقبالؔ عظیم بھی نعت گوئی کی تاریخ کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ مدحِ رسول ﷺ ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ فن انہیں اپنے دادا سید فضل عظیمؔ سے ورثے میں ملا۔ جو اردو و فارسی کے ایک نامور شاعر تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حبِ رسول ﷺ اقبالؔ عظیم کی شاعری کی جان ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ ان کا تعلق سادات کے ایک خانوادے سے تھا۔ وہ ایک سچے عاشقِ رسول ﷺ تھے۔ ان کی نعتوں میں رسول اللہ ﷺ سے عقیدت و محبت کا بھرپور اظہار ہے۔ جس

طرح غزل میں عام طور پر محبوبِ مجازی کے حسن کی تعریف کی جاتی ہے اسی طرح نعت میں بھی سراپا نگاری کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ چناچہ بہت سے دوسرے نعت گو شعرا کی طرح اقبال عظیم نے بھی اپنی نعتیہ شاعری میں محبوبِ کبریا ﷺ کے حسن و جمال، تبسم، اندازِ تکلم اور جبین پاک وغیرہ کی تعریف بڑے والہانہ انداز میں بیان کی ہے۔

ہمارے یہاں بالعموم نعت کے لیے غزل ہی کا پیرایہ اختیار کیا جاتا ہے اور یہ بات طے ہے کہ اچھی غزل کی خصوصیات نعت میں بھی اپنا رنگ دکھاتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ عشق و محبت اور سوز و گداز کی وہ کیفیات ہیں، جو غزل اور نعت میں بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔ بقول ناصر حیات:

> جب تک غزل میں کمال حاصل نہ ہو تب تک اعلیٰ پائے کی نعت تخلیق کرنا ممکن نہیں۔ اقبال عظیم عصر حاضر کے ان شعرا میں سے ہیں جن کی پہچان نعت ہے۔ لیکن نعت میں فنی کمال غزل ہی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔[۶۰]

اقبال عظیم نے اپنی غزلوں میں جن اقدار و روایات اور جذبات و احساسات کو پیش کیا، ان کا سرچشمہ بھی نبی مکرم ﷺ کی ذاتِ عالیہ سے ان کی قربت ہے۔ سید ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں کہ:

> غریبی کو احترام اور اعتماد عطا کرنا، اپنے سر کو مصائب میں بھی جھکنے نہ دینا، زندگی کے ہر لمحے کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی محبت سے آباد رکھنا سید اقبال عظیم کی زندگی کا خلاصہ ہے۔[۶۱]

اقبال عظیم کی غزلوں میں بھی ایسے اشعار موجود ہیں، جنھیں نعتیہ اشعار کہا جاسکتا ہے مثلاً

؎ کسی کے ہاتھ نے مجھ کو سہارا دے دیا ورنہ
کہاں میں اور کہاں یہ راستے پیچیدہ پیچیدہ[۶۲]

عشقِ الٰہی اور حبِ رسول ﷺ عاشقِ صادق سے اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ قرآن و سنت کے تمام احکامات پر مکمل عمل کرے۔ صرف زبان سے اقرار کر لینا کافی نہیں۔ اقبال عظیم اس اہم ترین نقطے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ پیروی چاہتا ہے جادۂ قرآن و حدیث
ان صحیفوں کو فقط گھر میں سجا مت دینا[۶۳]

الغرض اقبالؔ عظیم عصرِ حاضر کے ایک نامور شاعر ہیں۔ ان کی غزلیں اسی شعری روایت کا تسلسل ہیں، جس کی با قاعدہ ابتدا ولیؔ سے ہوئی اور جسے میرؔ، دردؔ، مصحفیؔ، مومنؔ، غالبؔ، آتشؔ، ناسخؔ، داغؔ، علامہ اقبالؔ، جگرؔ اور حسرتؔ موہانی وغیرہ نے پروان چڑھایا۔

اقبالؔ عظیم کی غزلیں عشق و محبت کے احساسات و جذبات سے لبریز ہے۔ ان میں تغزل، رومانویت، معاملہ بندی، کیفیت نگاری، درد و سوز، یادِ ماضی، احساسِ تنہائی، پاسِ ناموسِ عشق، محبوب کی بے رخی و بے نیازی، اور سراپا نگاری جیسے تمام پہلو بیان کیے گئے ہیں۔

انانیت و خودداری غالبؔ اور یگانہؔ کی طرح اقبالؔ عظیم کے مزاج میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اسی کا عکس ان کی غزلوں میں بھی جھلکتا ہے۔ بیشتر کلاسیکی شعرا کے برعکس ان کے یہاں عشق و محبت کے معاملات میں سپردگی کے مقابلے میں جارحیت کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ محبوب سے محبت کی بھیک نہیں مانگتے کیونکہ انہیں اپنا پندار بے حد عزیز ہے۔ اقبالؔ عظیم کا محبوب اسی دنیا سے تعلق رکھنے والا ایک عام فرد ہے۔ جس کے حسن و جمال سے انہیں والہانہ عشق ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسے یہ باور بھی کراتے ہیں کہ اسے اپنے حسن و جمال پر گھمنڈ نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ دنیا کی ہر شے کی طرح یہ بھی عارضی ہے اور اسے بھی سورج کی مانند اِک نہ اِک روز ڈھل جانا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اقبالؔ عظیم کے تصورِ عشق میں واضح تبدیلی رونما ہوئی اور ان کا دل دنیاوی محبوب کی بجائے محبوبِ حقیقی کی محبت سے سرشار ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس دور میں خالقِ کائنات کے قرب کا حصول اور دیدار کی خواہش جیسے موضوعات ان کی غزلوں میں بکثرت ملتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کا سب سے اہم تقاضا محبوبِ کبریا ﷺ سے والہانہ عشق اور ان کی تعلیمات کی پیروی ہے۔ اقبالؔ عظیم کا دل حبِ رسول ﷺ سے لبریز ہے۔ درحقیقت محبتِ رسول ﷺ ہی ان کی شاعری کی جان ہے اور یہی محبت انہیں غزل سے نعت گوئی کی طرف لے گئی، جس نے انہیں بامِ عروج پر پہنچا دیا۔

اس حقیقت سے تو انکار ممکن نہیں کہ اقبالؔ عظیم کی شہرت و مقبولیت کا زیادہ تر دارومدار ان کی نعت گوئی پر ہے۔ تاہم اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ نعت گوئی میں کمال غزل ہی کی بدولت پیدا ہوا۔ درد، سوز و گداز، ہجر و فراق اور وارداتِ قلبی کا اظہار، ان سب کیفیات کا بیان غزل ہی کے مرہونِ منت ہے۔ دوسرا یہ کہ رب تعالیٰ اور رسول

اللہ ﷺ کی تعلیمات کا خلاصہ حبِ انسانیت ہے۔ اقبالؔ عظیم کی غزلیں سر بسر محبت ہیں اور ان میں ساری نسلِ انسانی کے لیے پیار، امن اور محبت کا پیغام ہے۔

بحیثیت مجموعی اقبالؔ عظیم کی شاعری میں محبت کے تمام لہجے موجود ہیں۔ ان کی غزلیں اردو ادب کی شعری روایت کا تسلسل بھی ہیں اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بھی۔ ان کے ہاں ولیؔ کی جمال پرستی، میرؔ کے درد و غم، غالبؔ و یگانہؔ کی انانیت، داغؔ کی معاملہ بندی، جگرؔ کی شوخی اور فیضؔ کی رومانویت کا عکس اپنے ذاتی طرزِ اظہار کی خوبیوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں بے پناہ موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے۔ حبِ دنیا، عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی اور عشقِ رسول ﷺ کا بھرپور اظہار ان کی غزلوں کا بنیادی وصف ہے۔

حوالہ جات:

۱۔عبدالمجید سالک،مسلم ثقافت ہندوستان میں(لاہور:ادارہ ثقافت اسلامیہ،۱۹۵۷ء)،ص۵۳۸۔

۲۔عامر سہیل،سید، قاضی عابد(مرتبین)اردو کے نمائندہ کلاسیکی غزل گو(ملتان:اقبال پرنٹنگ پریس،۲۰۰۲ء)،ص۳۷۔

۳۔رفیع الدین ہاشمی،اصناف ادب(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص۳۴۔

۴۔ناصر حیات،اقبال عظیم حیات و ادبی خدمات(کراچی:توکل اکیڈمی کاشانہ خلیل،۲۰۱۲ء)،ص۱۲۰۔

۵۔نذیر احمد صدیقی،"اقبال عظیم"،مشمولہ روشنائی،جلد۸،۷(۳۰جولائی تا ستمبر۲۰۰۷کراچی)،ص۱۶۱۔

۶۔اقبال عظیم،کلیات غزل ماحصل(کراچی:توکل اکیڈمی کاشانہ خلیل،۲۰۱۰ء)،ص۹۵۔

۷۔ایضاً،ص۱۱۸۔

۸۔ایضاً،ص۲۷۰۔

۹۔ایضاً،ص۳۱۸۔

۱۰۔ایضاً،ص۷۵۔

۱۱۔ایضاً،ص۱۰۰۔

۱۲۔ناصر کاظمی،انتخاب میر(نصرت پریس،۱۹۸۷ء)،ص۱۵۷۔

۱۳۔سید وقار عظیم،"اسے میں تمھاری غزل کا بہت بڑا شاہکار سمجھتا ہوں"،مشمولہ روشنائی،ص۱۵۷۔

۱۴۔ناصر حیات،اقبال عظیم حیات و ادبی خدمات،ص۲۲،۲۳۔

۱۵۔اقبال عظیم،کلیات غزل ماحصل،ص۱۵۰۔

۱۶۔ایضاً،ص۲۳۵۔

۱۷۔ایضاً،ص۲۰۸۔

۱۸۔ایضاً،ص۲۳۱۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۴۹۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۲۶۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۱۷۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۲۵۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۸۶۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۹۵۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۴۳۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۹۷۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۹۸۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۵۳۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۴۱۰۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۵۹۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۷۹۔

۳۳۔ نورالحسن ہاشمی، کلیات ولی (لاہور: زاہد پرنٹرز، ۱۹۹۶ء)، ص ۲۴۰۔

۳۴۔ میر تقی میر، کلیات میر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۵۷۔

۳۵۔ حامد علی خان، دیوان غالب (لاہور: مجلس یادگار غالب پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۶۹ء)، ص ۸۷۔

۳۶۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (دہلی: ایجوکیشنل ہاؤس، ۲۰۰۵ء)، ص ۲۶۴۔

۳۷۔ ناصر حیات، اقبال عظیم حیات و ادبی خدمات، ص ۱۲۲۔

۳۸۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۱۴۹۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۵۶۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۶۱۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۲۱۶۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۳۹۹۔

۴۳۔ ارشد محمود ناشاد، "اسد اللہ خان غالب" https://www.facebook.com، ۱ دسمبر ۲۰۲۰ء، pm۹:۲۰۔

۴۴۔ حامد علی خان، دیوان غالب (لاہور: مجلس یادگار غالب پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۶۹ء)، ص ۲۳۔

۴۵۔ جمال عبدالواحد، غیر متداول کلام غالب (نئی دہلی: غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۱۶۔

۴۶۔ نذیر احمد صدیقی، "اقبال عظیم" مشمولہ روشنائی، ص ۱۶۲۔

۴۷۔ یاس یگانہ چنگیزی، http://www.rekhta.org، ۲۴ جنوری ۲۰۲۱ء، pm۹:۴۴

۴۸۔ یاس یگانہ چنگیزی، http://www.rekhta.org، ۲۴ جنوری ۲۰۲۱ء، pm۹:۴۴

۴۹۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۴۰۰۔

۵۰۔ ایضاً، ص ۴۰۰۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۴۰۰۔

۵۲۔ ایضاً، ص ۴۰۰۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۴۰۰۔

۵۴۔ انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۴۵۔

۵۵۔ نفیس اقبال، اردو شاعری میں تصوف میر: سودا اور درد کے عہد میں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۲۷۳۔

۵۶۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۱۶۸۔

۵۷۔ ایضاً، ص ۱۸۱۔

۵۸۔ القرآن سورۃ القلم، پارہ ۲۹، آیت نمبر ۴، تاج قرآن مجید اردو بازار لاہور، ص ۶۷۸۔

۵۹۔ ممتاز حسین، خیر البشر کے حضور میں (لاہور: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۷۵ء)، ص ا۔

۶۰۔ ناصر حیات، اقبال عظیم حیات و ادبی خدمات، ص ۱۱۶۔

۶۱۔ ابوالخیر کشفی، "ثنائے خواجہ اور اقبال عظیم" مشمولہ روشنائی، ص ۱۵۰۔

۶۲۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۱۰۱۔

۶۳۔ ایضاً، ص ۳۸۴۔

باب دوم:

اقبال عظیم کی غزلوں میں تصورِ غم

یہ کائنات اور اس کا سارا نظام تغیر و تبدل کے فطری اصول پر قائم ہے۔ اس قانون کی کار فرمائی ہمیں لیل و نہار کے اختلاف، موسموں کی تبدیلی اور خود انسان کی پیدائش اور وفات میں بخوبی نظر آتی ہے۔ جس طرح ہمیشہ دن کا سماں نہیں رہتا، ہمہ وقت روشنی نہیں ہوتی اور سال بھر بہار نہیں رہتی، بالکل اسی طرح انسان کی زندگی میں بھی نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ اور اسے سرشاری کے ساتھ ساتھ غم انگیز کیفیات سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ انسان ہمیشہ ہی سے اس بات کا خواہاں رہا ہے کہ اسے ہر اعتبار سے آسودگی حاصل ہو، ہمیشہ خوشیاں ہی اس کا مقدر ٹھہریں اور کبھی غم سے اس کا واسطہ نہ پڑے۔ مگر اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ موت سے پہلے اس سے نجات ممکن ہی نہیں۔ انسانی زندگی حزن و نشاط کے مختلف رنگوں اور صورتوں سے عبارت ہے۔ غم انسان کے لیے ناگزیر ہے اور زندگی کا حسن خوشی اور غم کی کشاکش ہی میں پوشیدہ ہے۔ حق یہ ہے کہ خوشی بھی غم ہی کے مرہونِ منت ہے۔

غم ایک ایسی کیفیت اور جذبے کا نام ہے جو کسی محرومی یا ادھورے پن کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ اس جذبے، کیفیت یا احساس کو بیان کرنے کے لیے سوز و گداز، رنج و کرب، آلام و مصائب، حزن و ملال اور دکھ درد جیسے الفاظ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہی غم کبھی اداسی، مایوسی، بے کسی، افسردگی، تنہائی اور فراریت کا باعث بنتا ہے اور کبھی اسی جذبے کی بدولت انسان نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے، صدمات جھیلنے، اور مردانہ وار زندگی جینے کا ہنر سیکھ لیتا ہے۔ غم کا عرفان و ادراک حاصل کیے بغیر انسان ادھورا رہتا ہے۔ غم کی دھیمی آنچ میں سلگنے ہی سے انسانی شخصیت کے جوہر نکھرتے ہیں۔ انسانی زندگی میں غم کے عناصر کچھ اس طرح پیوست ہیں کہ انہیں اس سے الگ کرنا ناممکن ہے۔ غم انسان پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ اس حقیقت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ سرشاری کی کیفیات تو انسان

فراموش کر دیتا ہے مگر غمگین لمحات کی یادیں کبھی اس کے دل سے محو نہیں ہو پاتیں۔ غم انفرادی طور پر فرد اور اجتماعی سطح پر سارے معاشرے میں سرائیت کر کے مختلف سماجی مسائل اور نفسیاتی الجھنوں کا باعث بنتا ہے۔

ہر شخص کے نزدیک غم کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ بیمار کے لیے بیماری، غریب کے لیے غربت، بیوہ کے لیے بیوگی، بے اولاد کے لیے بے اولادی، یتیم کے لیے یتیمی، معذور کے لیے معذوری، حاجت مند کے لیے احتیاج، مہاجر کے لیے ہجرت، بے روزگار کے لیے روزگار، عاشق کے لیے محبوب کی بے رخی اور پیار کرنے والوں کے لیے اپنے پیاروں سے بچھڑنے کا غم ہر غم سے بڑھ کر ہوتا ہے۔

دیگر بہت سے جذبات کی طرح جذبہ غم بھی اظہار کا متقاضی ہے۔ کوئی چیخ چلا کر، کوئی خود کو زدوکوب کر کے اور کوئی رو کر اپنا کتھارسز کرتا ہے۔ تخلیق کار چونکہ معاشرے کے عام افراد سے مختلف ہوتے ہیں۔ لہذا ان کے غم کے اظہار کا انداز بھی مختلف ہوتا ہے۔ مصور رنگوں، موسیقار اور گلوکار ساز و آواز اور شعرا و ادبا الفاظ کے توسط سے اپنے جذبات کی تطہیر اور اندرونی کرب کا اظہار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صدام حسین اپنے ایک مضمون میں تزکیہ نفس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> انسانی زندگی میں جذبات کا اظہار انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ بلکہ صحت مند ذہن و جسم کے لیے موقع و محل کی مناسبت سے اپنے جذبات کا اظہار کرنا بہت ضروری ہے۔ تحریر یا تقریر کی صلاحیت اللہ رب العزت کی عظیم نعمتوں میں سے ہے۔ جس شخص کو اللہ پاک نے یہ صلاحیت عطا کر رکھی ہو وہ شاذ ہی کبھی ڈپریشن یا گھٹن کا شکار ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اس صلاحیت کا استعمال جانتا ہو۔[1]

تمام فلسفی، مفکرین اور ادبا اس بات پر متفق ہیں کہ زندگی آلام و مصائب کا مجموعہ ہے۔ مغربی فکر و فلسفہ اور دنیا کے ہر ادب میں طربیہ کے مقابلے میں المیہ کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ اس ضمن میں نجم الدین احمد رقم طراز ہیں:

> شعر و ادب میں المیوں کی ایک طویل فہرست میرے سامنے موجود ہے جیسے ہومر کی اوڈیسی، جان ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ، کیٹس کی اوڈز، شیکسپیئر کا ہیملٹ، ٹالسٹائی کا اینا کیرنینا، گبریل گارشیا مارکیز کے ناول "ون ہنڈرڈ ائیرز آف سالیٹیوڈ" اور "لوان داڈیز آف کالرا"، کامیو کا پلیگ اور دنیا بھر کی عشق و محبت کی داستانیں چاہے وہ مغرب کی رومیو جولیٹ ہو یا مشرق کی شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، سسی پنوں، مرزا

صاحباں، قصہ سیف الملوک، ماروی عمر، نوری جام تماچی۔ میں نے دنیا بھر کے کلاسیکل ادب سے جدید ادب تک محض چند دانے شمار کیے ہیں وگرنہ المیوں کے ایسے ایسے شہ پارے خلق ہوئے ہیں کہ ادب عالیہ کے شمار کی تسبیح کے دانے بھی تھکنے لگیں۔[۲]

دنیا کے ہر ادب کی طرح اردو ادب میں بھی غم کی اہمیت مسلم ہے۔ اردو کی کوئی شعری و نثری صنف ایسی نہیں، جس میں المیہ عناصر موجود نہ ہوں۔ ناول، افسانہ، ڈرامہ، نظم، مرثیہ، قصیدہ، گیت اور غزل سبھی میں حزنیہ جذبات کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔

غزل داخلی کرب کے اظہار کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ اس لیے کہ اسی صنفِ سخن میں لطیف جذبات اور نازک احساسات بیان کرنے کی صلاحیت سب سے زیادہ ہے۔ غزل فارسی شاعری کے زیرِ اثر اردو ادب میں داخل ہوئی۔ لہٰذا اردو غزل کے مزاج کی تشکیل میں سیاسی،، سماجی اور اقتصادی عوامل کے علاوہ تصوف کی روایت کا بھی خاص عمل دخل ہے۔ فارسی شعرا میں شیخ سعدی، حافظ شیرازی اور مولانا رومی نے مثنوی کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی کہیں اور ان میں اپنے ذہنی و روحانی اضطراب کا اظہار کیا۔ اسی روایت کی پیروی کرتے ہوئے میر، درد، غالب، اقبال اور ان کے زیرِ اثر تقریباً تمام قابلِ ذکر شعرا نے زندگی کے المیہ تجربات کو ایک روحانی اور اخلاقی مفہوم عطا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا اور وحدت الوجود، وحدت الشہود، زندگی کی بے ثباتی، اشیا کی ناپائیداری اور دنیا کی فنا پزیری جیسے موضوعات کو اپنی غزلوں میں بیان کیا۔ صوفیا نے ہندی روایات کو نئے مفاہیم عطا کیے اور وہ الفاظ جو پہلے جنس کا ارضی زاویہ پیش کرتے تھے روحانیت سے مملو ہو کر نئی لو دینے لگے۔ بقول انور سدید:

بیشتر صوفیا کی شاعری میں خدا اور بندے کا تعلق پتی اور پیتم کی صورت میں ظاہر ہوا ہے اور معرفت کی بات برہا کی ماری اس عورت کی زبان سے کہی گئی ہے جو سنجوگ کے لیے بے قرار ہے۔[۳]

ان متصوفانہ افکار کی بدولت اردو غزل میں سوز و گداز پیدا ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ درد و الم کے بے شمار مضامین اس میں شامل ہوتے چلے گئے۔ رنج و غم کے موضوعات ہمیں اردو ادب کے تقریباً سبھی شعرا کے کلام میں ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ اردو کے وہ غزل گو شعرا جن کی شاعری پر نشاطیہ رنگ غالب ہے، ان کے یہاں بھی اندرونی

کرب اور وارداتِ قلبی کا پر درد اظہار ملتا ہے۔ علاوہ ازیں عشق میں ناکامی، محبوب کی بے وفائی و بے اعتنائی، تقدیر کی ستم ظریفی، بے روزگاری، معاشی عدم استحکام اور سیاسی و سماجی مسائل جیسے موضوعات بھی ان کی غزلوں میں بیان ہوئے ہیں۔ شمالی ہند میں اردو غزل کی آبیاری میں یوں تو کئی قد آور شعرا نے اپنا کردار ادا کیا تاہم میر تقی میر کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ناقدین نے انہیں اردو غزل کی آبرو قرار دیا ہے۔ ان کی ساری زندگی آلام و مصائب میں بسر ہوئی۔ میر والد کی زندگی میں صوفیا اور اہلِ دل کی صحبت میں رہے۔ انہوں نے ان اولیاءاللہ کی سوز و گداز سے لبریز گفتگو سے خوب کسبِ فیض کیا۔ اس کا اثر ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے متعدد اشعار میں زندگی کے حقائق کی نقاب کشائی کی ہے۔ دبستانِ دلی کے اور بہت سے شعرا کی طرح میر کے یہاں بھی دنیا کی بے ثباتی کا غم کثرت سے بیان ہوا ہے۔ مثلاً

؎ آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا[۴]

میر کی غزلیں رنج و الم اور درد مندی کے جذبات سے معمور ہے۔ بقول رام بابو سکسینہ: "میر آزل ہی سے درد مند دل لے کر آئے تھے اور ان کو دنیا میں سوائے رنج و الم کے کچھ اور دکھائی نہیں دیتا تھا۔"[۵] میر کی شاعری غمِ عشق، غمِ روزگار، غمِ جہاں، اپنوں کی بے رخی، زمانے کی ناقدری اور دلی کی بربادی کا مرثیہ ہے۔ انہوں نے زندگی کے تلخ تجربات اور خود پر گزرنے والے آلام و مصائب کو شعر کے پیکر میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھنے والوں کو اس میں اپنے ذاتی تجربات اور درد کی کسک محسوس ہوتی ہے۔ بقول ابنِ انشا:

؎ اللہ کرے میر کا جنت میں مکاں ہو
مرحوم نے ہر بات ہماری ہی بیاں کی[۶]

اگر یہ کہا جائے کہ میر نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ میر کے یہ منتخب اشعار ان کی مختلف غم انگیز کیفیات کے عکاس ہیں:

؎ میرے رونے کی حکایت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا[۷]

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشمِ گریہ ناک
مژگاں تو کھول، شہر کو سیلاب لے گیا[8]

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی، پھوٹ بہے
درد مندی میں گئی ساری جوانی اس کی[9]

انیسویں صدی میں مرزا اسد اللہ خان غالبؔ نے اردو غزل کو بامِ عروج پر پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انہیں جدتِ طبع اور ندرتِ بیان کی بنا پر اپنے ہم عصر شعرا میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ انہیں کی بدولت دامنِ غزل میں وسعت پیدا ہوئی۔ وہ انسانی نفسیات کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ ان کی غزلوں میں عشق و محبت کے لطیف جذبات، فلسفیانہ رنگ، حکیمانہ بصیرت اور زندگی کے جملہ حقائق و مسائل کی ترجمانی نہایت دلکش اور منفرد انداز میں کی گئی ہے۔ ان کے کلام میں فکر کی گہرائی جذبے کی صداقت اور جمالیاتی محاسن سب یکجا ہو گئے ہیں۔

غالبؔ بھی تمام عمر آلام و مصائب کا شکار رہے۔ بچپن ہی میں انہیں یتیمی کا دکھ اٹھانا پڑا۔ چچا کی وفات بھی جلد ہو گئی۔ محض چودہ برس کی عمر میں خانگی ذمہ داریوں کا بوجھ ان کے کاندھوں پر آن پڑا، جس سے ان کے اخراجات میں اضافہ ہو گیا۔ مستقل ذریعہ معاش نہ ہونے کی وجہ سے غالب ہمیشہ معاشی تنگ دستی کا شکار اور دوسروں کے مقروض رہے۔ چچا کی نصف پینشن کچھ عرصہ انہیں ملتی رہی۔ مگر غدر کے بعد وہ بھی ملنا بند ہو گئی اور غالب کو اس کی بحالی کے لیے کلکتہ تک کا سفر کرنا پڑا۔ ان کے یہاں سات اولادیں ہوئیں مگر ایک بھی جان بر نہ ہوئی۔ لے پالک بیٹے زین العابدین خان عارفؔ کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا اور ان کے تین بچوں کی پرورش کی ذمہ داری بھی انہیں پر آن پڑی۔

غالبؔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے عینی شاہد تھے۔ انہوں نے دلی اور مغلیہ سلطنت کی بربادی کے دل خراش مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اور اس صورتِ حال کا بغور مشاہدہ کیا تھا۔ اس سانحے کے نتیجے میں ان کے بہت سے عزیز و اقارب اور احباب وفات پا گئے یا دلی سے ہجرت کر کے کہیں اور منتقل ہو گئے۔ ان کی دوری کا رنج غالب کو تا عمر تڑپاتا رہا۔ اپنے اسی اندرونی کرب کا اظہار کرتے ہوئے وہ ایک خط میں لکھتے ہیں: "جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو

زیست کیونکر دشوار نہ ہو، ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے، ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہو گا۔"[10] غالب طبعاً افسردہ مزاج نہ تھے۔ ان کی شاعری بحیثیت مجموعی زندگی سے بھرپور ہے اور جینے کا حوصلہ اور سلیقہ عطا کرتی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> غالب کی شاعری میں خواہش، حسرت اور ناتمامی کی صورت میں ملتی ہے۔ مگر ان کی نفسی توانائی کا یہ شعلہ بدستور روشن رہتا ہے۔ ان کے ہاں "شکستِ آرزو" کا مطلب مزید آرزو سے وابستہ ہے۔ وہ شکست سے حوصلہ نہیں ہارتے بلکہ "تجدید تمنا" کے لیے جستجو کرتے ہیں۔ آرزو میں احساسِ شکست ان کے اندر حوصلہ مندی، جگر داری اور ولولہ انگیزی کو جنم دیتا ہے۔ گویا غالب شکستِ آرزو سے مغلوب اور بے دل نہیں ہوتا۔[11]

لیکن اس کے باوجود ہمیں ان کی غزلیات میں حزنیہ عنصر بھی محسوس ہوتا ہے۔ جو یقیناً متصوفانہ افکار، فارسی شاعری کی روایت، زندگی کے تلخ تجربات اور ان کے عہد کے سیاسی و سماجی اور خارجی حالات کی دین ہے۔ وہ قلبِ انسانی میں پوشیدہ سوز و الم کو جہنم کی آگ سے زیادہ شدید قرار دیتے ہیں:

؎ آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے[12]

فلسفۂ غم کے حوالے سے غالبؔ کا نقطۂ نظر واضح اور حقیقت پر مبنی ہے۔ ان کے نزدیک زندگی اور غم ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ آلام و مصائب برداشت کرنا گو انتہائی تکلیف دہ عمل ہے مگر روزِ ازل ہی سے انسان کی قسمت میں دکھ سہنا لکھ دیا گیا تھا۔ لہٰذا اب غم کی نوعیت تو بدل سکتی ہے مگر اس سے فرار ممکن نہیں۔ وہ کہتے ہیں:

؎ غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا[13]

غالبؔ زندگی کے لیے اس شمع کا استعارہ استعمال کرتے ہیں جو طلوعِ سحر سے قبل ہر حال اور کسی بھی رنگ میں جلتی ہے مگر اپنی مرضی سے بجھ نہیں سکتی۔ انسان بھی کم و بیش ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہے۔ اس لیے کہ وہ بھی اپنی

مرضی کے برخلاف غم سہنے پر مجبور ہے۔ غالبؔ اس آفاقی سچائی کے معترف ہیں کے موت ہی انسان کے دکھ درد کا واحد علاج ہے اور موت سے قبل رنج و آلام سے نجات ممکن ہی نہیں۔

؎ غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک[۱۴]

؎ قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں[۱۵]

بیسویں صدی میں اردو غزل کو علامہ محمد اقبالؔ نے نئی فکری جہت سے آشنا کیا۔ ان کا شمار عالمِ اسلام کے عظیم فلسفیوں اور شعرا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے امتِ مسلمہ کی بیداری کا فریضہ سرانجام دیا۔ ان کا کلام حرکت و عمل، تسخیرِ کائنات، مشاہدۂ فطرت، عظمتِ انسانی، معرفتِ الٰہی اور عشقِ رسول ﷺ کی ترغیب دیتا ہے۔ خودی، بے خودی، شاہین، بندۂ مومن اور عقل و عشق ان کی شاعری کے نمایاں تصورات ہیں۔

میرؔ و غالبؔ کی طرح اقبالؔ بھی غم کو زندگی کا لازمہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگرچہ زندگی خوشیوں سے لبریز ہے۔ مگر غم بھی کتابِ زیست کا ایک نہایت اہم باب ہے۔ ہر ذی روح کو زندگی کے نشیب و فراز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ بلبل کی قسمت میں محض بہار ہی رہے اور اسے خزاں سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ انسانیت کا راگ آہ و فغاں کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتا۔ کوئی بھی شخص لذتِ غم سے آشنا ہوئے بنا انسانیت کے منتہائے کمال تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ بصیرت غم کو عزیز جانتے ہیں۔ کیونکہ فطرتِ انسانی حوادثِ غم ہی سے جلا پاتی ہے۔ دل کی کہانی آرزوؤں اور تمناؤں کے خون ہی سے رنگین ہے۔ اقبالؔ غم کو روح کا ایک خاموش راگ قرار دیتے ہیں، جو زندگی کے ساز سے ہم آغوش ہے۔

اقبالؔ کے نزدیک وہ شخص جس نے اپنی راتیں اللہ کے حضور گریہ وزاری میں نہ بتائی ہوں، جسے کبھی دل شکستگی کا احساس نہ ہوا ہو، جس کے ہاتھ پھول توڑتے ہوئے کبھی کانٹوں سے زخمی نہ ہوئے ہوں اور جس نے عشق میں ہجر کا آزار

برداشت نہ کیا ہو، ایسا شخص گو غم کی اذیتوں سے تو محفوظ رہتا ہے، مگر زندگی کا حقیقی راز بھی نہیں پا سکتا۔ نظم "فلسفۂ غم" میں اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

شام جس کی آشنائے نالۂ 'یا رب' نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں
جس کا جام دل شکست غم سے ہے ناآشنا
جو سدا مست شراب عیش و عشرت ہی رہا
ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوک خار سے
عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے
کلفت غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے[16]

فکریاتِ اقبال میں عشق کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے نزدیک دنیا کی ہر شے فانی ہے۔ حتیٰ کہ غم بھی عارضی اور ناپائیدار ہے۔ صرف عشق ہی وہ جذبہ ہے جو زندہ و جاوید ہے۔ ان کے خیال میں اپنوں کی دائمی جدائی سے بھی عشق قائم و دائم ہی رہتا ہے۔ یہ جذبہ غم کی صورت ہماری روح میں رہتا ہے، مگر فنا نہیں ہوتا۔ نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" میں وہ کہتے ہیں:

؎ زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ڈوبنا جس کا مقدر ہو، یہ وہ گوہر نہیں[17]

اقبال غم کو زندگی میں تحرک اور جذبوں میں حرارت کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وصل کو ہجر پر اور درد و سوز اور آرزو مندی کو شانِ خداوندی پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کے انہیں خیالات کے ترجمان ہیں:

؎ عالمِ سوز و ساز میں، ہجر سے بڑھ کر ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طرب[18]

متاعِ بے بہا ہے درد و سوز و آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر، نہ لوں شانِ خدا وندی[19]

اقبالؔ ایک درد مند اور حساس شاعر تھے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ساری انسانیت کا درد ان کے سینے میں سمٹ آیا ہو۔ انہوں نے انسانی دکھوں کو ذاتی سطح پر محسوس کیا اور اپنی شاعری کے ذریعے ان کے تدارک کی شعوری کوشش بھی کی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ان کی نظریں یہ دیکھتی ہیں کہ انسانیت گھائل ہے۔ قومی، نسلی اور ملکی تفریق نے اسے زخموں سے چور کر دیا ہے۔ ان کی تعلیم ان زخموں پر مرہم رکھنے اور ان کو مندمل کرنے کی تعلیم ہے۔ ان کا پیام ان زخموں کو بھرنے کا پیام ہے۔[20]

اردو غزل کو درد و سوز اور رنج و الم کے مضامین عطا کرنے والوں میں فانیؔ بدایونی کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا شمار بیسویں صدی کے ممتاز غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ یوں تو ان کے کلام میں فلسفہ، تصوف، خودداری، حسن و عشق اور وارداتِ قلبی کا بیان بھی ملتا ہے، مگر حزن و یاس ان کی غزل کا امتیازی وصف ہے۔ اسی لیے انہیں "یاسیت کا امام" بھی کہا جاتا ہے۔ وہ مستقل مزاج نہ تھے۔ لہٰذا پیشہ ورانہ زندگی میں بھی ناکام و نامراد اور معاشی تنگ دستی کا شکار رہے۔ ان کی بیشتر غزلیں انہیں محرومیوں، مایوسیوں اور ناتمام حسرتوں کا نوحہ ہیں۔ وہ زندگی کو بے معنی شے اور دیوانے کا خواب قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک موت ہی غم واندوہ سے نجات اور محرومیوں کے تدارک کا واحد ذریعہ ہے۔ ان کی فکر پر میرؔ اور زبان پر غالبؔ کے اثرات واضح ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں۔ فانی کی اسی انفرادیت کا اعتراف کرتے ہوئے قاضی عبدالغفار کلیاتِ فانی کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> فلسفۂ غم کو اس نے ایک ایسی بلندی پر پہنچایا جہاں وہ اس کی زندگی کی آبرو کا محافظ بن گیا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر فلسفۂ غم سے ان کے افکار اس قدر متاثر نہ ہوئے ہوتے تو شاید ان کی انفرادیت اس مقام تک نہ پہنچ سکتی جہاں اس کو ہم دیکھ رہے ہیں۔[21]

فانیؔ کے کلام میں نہ میرؔ کی سی ہمہ گیریت ہے اور نہ غالبؔ کا سا تنوع۔ ان کی فکر کا دائرہ محدود ضرور ہے، مگر اس میں تاثیر، خلوص اور صداقت کی کمی نہیں۔ ہم ان کے تصورِ حیات سے متفق ہوں یا نہ ہوں، لیکن ان کے حزنیہ انداز سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کے انہی حزنیہ افکار کے غماز ہیں:

سنے جاتے نہ تھے تم سے، مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ[۲۲]

بھلا نہ دل، نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں[۲۳]

اک معمہ ہے سمجھنے کا، نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا[۲۴]

میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد اردو غزل کو نئے افق سے ہم کنار کرنے والے شعرا میں فیض احمد فیضؔ کا نام انتہائی معتبر ہے۔ ان کے کلام میں بھی درد و کرب کی آنچ اور رنج و غم کا تاثر ملتا ہے۔ ان کا غم ذاتی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ ان کی شاعری میں لفظ "درد" مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں یہ محبوب کی بے رخی کا درد ہے اور کہیں وطن کی محبت کا۔ ان کے یہاں ہر طرح کے درد و غم میں ایک اضطراب کی سی کیفیت ملتی ہے۔ جس سے جدوجہد اور عمل کی راہیں وا ہوتی ہیں۔ بارہا قید و بند کی صعوبتوں اور حوادثِ زمانہ نے اس غم کو مزید گہرائی، گیرائی اور آفاقیت عطا کر دی ہے۔ بقول ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی:

> قید نے فیضؔ کے کلام کو درد و سوز، جلال و جمال، امید و یقین، عزم و استقلال عطا کیا ہے۔ ان کے فن میں خونِ جگر کی آمیزش سے صداقت آئی، جس میں تڑپ بھی ہے اور جوش بھی، سادگی بھی ہے اور رعنائی بھی، ایک ایسی کشش ہے جو سینکڑوں دلوں کو موہ لیتی ہے۔ ایک ایسی آنچ ہے جو سینکڑوں دلوں کو پگھلا دیتی ہے۔[۲۵]

فیضؔ رنج و غم اور آلام و مصائب پر چیخنے چلانے اور واویلا کرنے کی بجائے درد برداشت کرنے اور ظلم و ستم سہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنی غمگین کیفیات اور احساسات کو انتہائی دھیمے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ معاشرتی ناہمواریوں اور ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج تو بلند کرتے ہیں مگر ان کا کمال یہ ہے کہ ان کا لب و لہجہ دیگر ترقی پسند شعرا کی طرح تند و تیز نہیں ہونے پاتا بلکہ اس میں ایک دھیمی دھیمی آنچ کی سی کیفیت رہتی ہے۔ مثلاً

؎ کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے[۲۶]

؎ نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی صحیح
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی صحیح[۲۷]

؎ دنیا نے تری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روز گار کے[۲۸]

قیامِ پاکستان کے بعد اردو غزل کو پر درد آہنگ عطا کرنے والے شعرا میں سب سے توانا آواز ناصرؔ کاظمی کی ہے۔ اگرچہ ان کی غزلوں پر میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور فراقؔ کے واضح اثرات موجود ہیں۔ لیکن اسکے باوجود ان کی انفرادیت برقرار رہتی ہے۔ وہ تقسیمِ برِصغیر کے عینی شاہد تھے۔ انہوں نے ہجرت کے روح فرسا مناظر کا گہرا اثر قبول کیا اور اپنی غزلوں میں ان انسانیت سوز واقعات کی سچی تصویر پیش کی۔ اس سانحے نے ان کی روح تک کو زخمی کر دیا۔ ان زخموں کے درد کی کسک ان کی غزلوں میں بخوبی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ترکِ وطن کے کرب، پرانی تہذیب کی شکست و ریخت، ماضی کی یادوں، سفرِ ہجرت کی صعوبتوں، خانہ بدوشی کی تلخیوں، فکرِ معاش، تنہائی کی اذیت اور نئے وطن میں اجنبیت کے احساس سے ان کی غزلوں میں گہری اداسی پیدا ہو گئی ہے۔ ناہید قاسمی ان کی اس اداسی کی بابت لکھتی ہیں:

ناصرؔ کے یہاں ان کی ذاتی اداسی کی جو گھٹا امڈی تھی، وہ ساری کائنات پر پھیل گئی۔ ناصرؔ کی اداسی میں سارا جہاں سمٹ آیا ناصرؔ کاظمی کے کلام میں ایک قسم کی زیرِ لب افسردگی ملتی ہے۔ اس افسردگی کو نا مرادی اور مریضانہ داخلیت سے تعبیر کرنا مناسب نہیں۔[۲۹]

ناصرؔ کے درج ذیل اشعار ان کی اسی اداسی اور زندگی کی متنوع کیفیات کے عکاس ہیں:

؎ تنہائیاں تمہارا پتہ پوچھتی رہیں
شب بھر تمہاری یاد نے سونے نہیں دیا[۳۰]

؎ دل تو میرا اداس ہے ناصرؔ
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے[۳۱]

؎ انبالہ ایک شہر تھا، سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی[۳۲]

مذکورہ شعرا کے علاوہ بھی ان غزل گو شعرا کی ایک طویل فہرست ہے، جنہوں نے اردو غزل کو حزنیہ مضامین سے مزین کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان میں فراقؔ، قتیلؔ شفائی، منیرؔ نیازی، مجید امجدؔ، احمد ندیمؔ قاسمی اور اقبالؔ عظیم وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اقبالؔ عظیم کے سوانحی حالات اور غزلیات کے مطالعے سے یہ بات واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے کہ انہوں نے اپنی ذاتی زندگی میں بہت سے غم اٹھائے اور صدمات برداشت کیے ہیں۔ کئی نشیب و فراز دیکھے مگر ایک باحوصلہ انسان کی طرح ان کا مقابلہ بھی کیا۔ ان کے غم کے صوتے اگرچہ ان کی ذاتی زندگی سے پھوٹتے ہیں۔ لیکن انہوں نے جس خلوص اور سچائی کے ساتھ اپنے حسی و جذباتی تجربات نظم کیے ہیں ان میں ہر قاری کو اپنے ذاتی تجربات کی کسک محسوس ہوتی ہے۔ یوں تو ان کی پوری زندگی غم و آلام سے عبارت ہے تاہم غمِ جاناں، غمِ روزگار، غمِ بے نگاہی اور دہری ہجرت

کے غم کو ان کے کلام میں مرکزیت حاصل ہے۔ اقبال عظیم اپنے درد و غم کو ذاتی سطح پر محسوس کرتے ہیں۔ مگر بزمِ داستان تک پھیلا کر اس کا ابلاغ نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں:

ہمارا غم ہمارا ایک ذاتی مسئلہ ہے
زمانے بھر کو افسانہ سنا کر کیا کریں گے؟[۳۳]

وہ بیانِ حالِ دل کے قائل نہیں۔ ان کی خوددار طبیعت انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ فسانۂ غمِ دل ہر ایک کو سناتے پھریں۔ ان کے نزدیک دل کے زخموں کی نمائش جرم ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> میری مجبوری یہ ہے کہ اپنے وہ زخم آپ کو نہیں دکھا سکتا جو انہیں گلی کوچوں میں میں نے در پردہ اور دیدہ و دانستہ کھائے۔ اس لیے کہ وہ زخم ماضی کی مقدس امانتیں ہیں جن کی نمائش جرم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان زخموں کی خوشبو میری غزلوں میں کہیں نہ کہیں آپ کو خود محسوس ہو جائے۔ خاص طور پر ابتدائی دور کی غزلوں میں۔[۳۴]

اقبال عظیم کی شاعری میں واقعی ان زخموں کی خوشبو اور رنج و کرب کی کسک با آسانی محسوس کی جا سکتی ہے۔ شاعر لاکھ چاہے کہ کوئی اس پر گزرنے والی غم انگیز کیفیات سے آگاہ نہ ہو اور نہ غم گساری کرے، مگر اس کے اشعار سارے زمانے کو اس کا واقفِ حال کر دیتے ہیں۔ بقول غالب:

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے[۳۵]

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زندگی ایک ہی ڈگر پر رواں دواں نہیں بلکہ اس میں اتار چڑھاؤ کی کیفیات پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی وقت انسان کے اس قدر موافق ہوتا ہے کہ سب ویسا ہی ہوتا ہے جیسا وہ چاہتا ہے۔ اور کبھی اسے اپنی زندگی میں ایسے لمحات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جب کچھ بھی اس کے اختیار میں نہیں رہتا، آلام و مصائب اسے گھیر لیتے ہیں، محرومیاں اس کا مقدر بن جاتی ہیں اور وہ خود کو بے کس و مجبور محسوس کرنے لگتا ہے۔ مگر دنیا میں کچھ افراد ایسے بھی ہیں، جو مغموم اور محرومیوں کا شکار ہوتے ہوئے بھی نہ تو ہمہ وقت گریہ کناں رہتے ہیں اور نہ ہی اپنی محرومیوں کا رونا رو کر خود کو مظلوم ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اقبالؔ عظیم کا شمار بھی ایسے ہی شعرا میں ہوتا ہے، جنہیں تمام عمر غموں اور محرومیوں سے نبرد آزما رہنا پڑا مگر ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ ان کی غزلیں انہیں دکھوں اور غموں کا فسانہ ہیں، جن میں وہ تقریباً زندگی بھر مبتلا رہے۔

؎ غزل بہانہ ہے اقبالؔ لب کشائی کا
فسانۂ غمِ پنہاں ہے، شاعری کیا ہے؟[۳۶]

ناقدین نے اقبالؔ عظیم کی شاعری کو دو ادوار میں منقسم کیا ہے۔ پہلا دور ابتدا سے مشرقی پاکستان منتقلی تک کے عرصے پر محیط ہے جبکہ دورِ ثانی ہجرت سے وفات تک کے دورانیے پر مشتمل ہے۔ زیرِ تحقیق باب میں انہیں ادوار کے اعتبار سے اقبالؔ عظیم کی غزلوں میں تصورِ غم کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

اقبالؔ عظیم کی شاعری میں غم کی متنوع کیفیات کا جائزہ لینے کے لیے ان کے سوانحی حالات اور زندگی میں پیش آنے والے ان واقعات سے آگہی بھی اشد ضروری ہے جو ان کی غزلوں کا محرک بنے۔ اقبالؔ عظیم کی پیدائش ۱۹۱۳ء کو میرٹھ میں ہوئی۔ ان کے والد سید مقبول عظیم عرشؔ محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے۔ ان کی شادی فارسی کے نامور شاعر، ادیب میرؔ میرٹھی کی صاحب زادی محمود فاطمہ سے ہوئی۔ ان کے بطن سے ان کی تین اولادیں ہوئیں۔ بچپن ہی میں اقبالؔ عظیم کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور وہ مادرِ حقیقی کی شفقت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ کم عمری میں والدہ کے دنیا سے رخصت ہو جانے سے ان کی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا وہ کبھی پُر نہ ہو سکا۔ اقبالؔ عظیم کے والد کی دوسری شادی ان کی خالہ کلثوم فاطمہ سے ہوئی۔ اگرچہ انہوں نے اقبالؔ عظیم کی پرورش بہت اچھے انداز میں کی مگر حقیقی والدہ کی کمی ہمیشہ انہیں محسوس ہوتی رہی اور یہ غم شعوری و لاشعوری طور پر انکی ذات کا مستقل حصہ بن گیا۔

سید مقبول عظیم کے یہاں دوسری بیوی کلثوم فاطمہ کے بطن سے سات اولادیں ہوئیں۔ وہ اقبالؔ عظیم سمیت اپنے دس بچوں اور اہلیہ کے واحد کفیل تھے۔ ان کا تبادلہ بسلسلۂ ملازمت مختلف شہروں میں ہوتا رہا۔ لہٰذا اقبالؔ عظیم کی پرورش اور تعلیم و تربیت پردیس ہی میں ہوئی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وطن سے دوری کا احساس انہیں عمر بھر رہا۔ ان کی شاعری اور تحریروں دونوں ہی میں غریب الوطنی کا کرب شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وطن سے دوری کا سبب یہ ہے کہ بسلسلۂ ملازمت والد صاحب قبلہ ہمیشہ پردیس میں رہے۔ اس لیے ہم بہن بھائیوں کی پیدائش اور پرورش غریب الوطنی کے عالم میں ہوئی اور یہ غریب الوطنی کچھ اس طرح میرا مقدر بن گئی کہ ابتدا سے آج تک دم قدم کے ساتھ ہے۔[۳۷]

اقبال عظیم نے گورنمنٹ ہائی سکول اناؤ سے میٹرک، گورنمنٹ کرسچن کالج لکھنؤ سے انٹر میڈیٹ اور "لکھنؤ یونیورسٹی" سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ بی اے پاس کرنے کی خوشی اس وقت غم میں بدل گئی، جب صرف دو ماہ بعد پہلے والد اور پھر دوسری والدہ کا انتقال ہو گیا اور سات چھوٹے بہن بھائیوں کی پرورش کا بوجھ ان کے کاندھوں پر آن پڑا۔ بڑے بھائی وقار عظیم ان دنوں ریسرچ سکالر کی حیثیت سے الہ آباد یونیورسٹی میں کام کر رہے تھے۔ لہٰذا گھر کے اخراجات میں ایک خاص حد سے زیادہ ہاتھ بٹانا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ اقبال عظیم نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے "ٹیچرز ٹریننگ کالج لکھنؤ" میں داخلہ لے لیا۔ تاکہ کم سے کم مدت میں مستقل ذریعہ معاش حاصل کیا جا سکے۔ آزمائشوں سے بھرپور اس دور کو یاد کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

کشتی کس طرح کنارے لگی، نہ اس کی تفصیل کے لیے میرے پاس الفاظ ہیں، نہ یہ تفصیل سن کر آپ خوش ہوں گے۔ اس لیے صرف اتنا اشارا کافی ہے کہ مختصر سا یہ دور میرا سب سے بڑا معلم ثابت ہوا۔ پہلے پہل زندگی سے دوبدو ٹکر لینا پڑی۔ اسی دور نے میرے مزاج کو وہ پندار اور ارادوں کو وہ پختگی عطا کی جس نے بعد کی زندگی میں ہر قدم پر مجھے سہارا دیا۔[۳۸]

اب تک انہیں صرف غمِ روزگار ہی کی فکر لاحق تھی۔ غمِ عشق سے کچھ سروکار نہ تھا۔ مگر یہاں انہیں اس غم کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ گزشتہ باب میں اس واقعے کا ذکر تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ جب وہ ٹیچرز ٹریننگ کالج لکھنؤ میں زیرِ تعلیم تھے تو انہیں ایک کرسچن لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنانے کے خواہاں بھی تھے۔ مگر لڑکی کے والد نے مذہب تبدیل کرنے کی شرط عائد کر دی۔ اقبال عظیم جیسے موحد اور سچے عاشقِ رسول ﷺ کے لیے یہ شرط کسی طور قابلِ قبول نہ تھی۔ چنانچہ انہیں محبت میں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور اس ناکامی و نامرادی کا رنج بھی ان کی ذات میں شامل ہو کر شاعری میں سرائیت کر گیا۔ اس کی کسک ان کی غزلوں کے متعدد اشعار میں شدت سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ مثلاً:

؎ یاد آتی ہے جب عہدِ محبت کی شروعات
آنکھوں سے لہو بن کے چھلک جاتے ہیں جذبات[۳۹]

؎ جو رات کبھی رشکِ سحر تھی ترے دم سے
وہ رات ترے ہجر میں ڈھلتی ہے بمشکل[۴۰]

؎ کچھ اہلِ وفا اس دنیا میں، یادوں کے سہارے جیتے ہیں
جو دورِ محبت روٹھ گیا، اُس دور کا اب ماتم ہی سہی[۴۱]

؎ اگرچہ ختم ہوئی داستانِ پارینہ
تُو ہی ہے آج بھی عنوانِ زندگی اے دوست[۴۲]

اقبال عظیم کے نزدیک غمِ روزگار ہو یا غمِ جاناں، دونوں کسی عذاب سے کم نہیں اور دونوں ہی آدمی کو کہیں کا نہیں چھوڑتے:

؎ غمِ جاناں بھی دیکھا ہے، غمِ دوراں بھی دیکھا ہے
عذابِ زندگی یوں بھی، عذابِ زندگی یوں بھی[۴۳]

اس میں کچھ شک نہیں کہ دونوں ہی غم اور عذاب اپنی اپنی جگہ تکلیف دہ ہیں مگر "تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے" کے مصداق غمِ دوراں کی اہمیت مسلم ہے۔ اس لیے کہ پیٹ کا دوزخ بھرنے کی فکر ہر غم پر بھاری ہے اور اس سے کسی طور فرار ممکن نہیں۔ اقبال عظیم بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ اس زمانے کے بے کیف ماحول میں، ذکرِ رعنائیِ چشم و ابرُو کہاں
اب حقائق سے دوچار ہے زندگی، مہلتِ فکرِ رخسار و گیسو کہاں[۴۴]

میں شگفتہ لبِ اظہار کہاں سے لاؤں
عشق و رومان کے اذکار کہاں سے لاؤں
قصۂ تلخیٔ دوراں میں سنا سکتا ہوں
داستانِ لب و رخسار کہاں سے لاؤں[۴۵]

"ٹیچرز ٹریننگ کالج لکھنؤ" سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہوں نے "گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ" میں عارضی طور پر ملازمت اختیار کر لی۔ آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ سٹیشن سے لیو ارین جمینٹس کے تحت ڈرامہ سیکشن میں بھی کام کرتے رہے۔ علاوہ ازیں "ترقی" نامی ایک ہفت روزہ اخبار کے مدیر بھی رہے۔

اقبال عظیم کے لیے ۱۹۳۵ء سے فروری ۱۹۴۹ء تک کا زمانہ انتہائی صبر آزما رہا۔ کئی سالوں کی ان تھک جدوجہد کے بعد بالآخر ۱۶ مارچ ۱۹۴۹ء کو انہیں گورنمنٹ ہائی سکول حمیر پور میں باقاعدہ سرکاری ملازمت کا پروانہ مل گیا۔ مگر ستم یہ ہوا کہ انہیں لکھنؤ کی گلیوں سے جدائی قبول کرنا پڑی۔ اقبال عظیم کو لکھنؤ سے بے پناہ محبت تھی۔ اس لیے کہ ان کی زندگی کا وہ حصہ اودھ کی گلیوں میں بسر ہوا، جس میں انسانی شعور اپنی راہیں متعین کرتا اور احساسات و جذبات تہذیب و تشکیل کی منزلوں سے گزرتے ہیں۔ وطن سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> سرزمینِ لکھنؤ کے ایک ایک چپے سے مجھے وہی والہانہ تعلق خاطر ہے جو کسی کو اپنے وطنِ عزیز سے ہونا چاہیے۔ بلکہ میرے قلب و دماغ اور ذہن و ضمیر کو ان خوش گوار فضاؤں میں جو کچھ میسر آیا، وہی میری زندگی کی اساس اور شخصیت کی بنیاد ہے۔[۴۶]

لکھنؤ کی شعری و ادبی فضا اقبال عظیم کی شاعرانہ طبیعت کے لیے انتہائی ساز گار تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ لکھنؤ ہمیشہ ہی سے علم و ادب کا گہوارا اور مرجع اہلِ دانش رہا ہے اور یہی سرزمین ایک عظیم الشان شعری روایت کی امین بھی ہے جہاں مصحفی، انشا، جرات، آتش اور ناسخ جیسے نامور شعرا ابھر کر سامنے آئے۔ ان شعرا نے نہ صرف اردو شاعری بالخصوص غزل کی آبیاری میں نمایاں کردار ادا کیا بلکہ اپنے بعد نئے آنے والوں کے لیے ایک مضبوط بنیاد بھی فراہم کی۔ دوسرا یہ کہ اقبال عظیم کے والد پینشن لے کر لکھنؤ منتقل ہو گئے تھے اور اس دور کی بہت سی قد آور ادبی شخصیات مثلاً نیاز فتحپوری، بہزاد لکھنوی، شاہ بے دم وارثی، وصل بلگرامی، سراج لکھنوی اور قدیر لکھنوی وغیرہ سے ان کے دوستانہ

مراسم تھے۔ ان کے گھر پر باقاعدگی سے شعری نشستیں منعقد ہوتی تھیں۔ ان میں مذکورہ بالا شخصیات کے علاوہ اور بہت سے شعرا بھی شریک ہوتے۔ اقبال عظیم کو بھی ان اساتذۂ علم و فن سے فیضیاب ہونے اور ان کے رُوبرُو کلام سنانے کا موقع ملتا۔ مذکورہ شعری محافل کے علاوہ وہ لکھنؤ کے طول وارض میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں بھی شرکت کرتے اور دادِ سخن پاتے۔ اس دورِ مختصر کو وہ تمام عمر کا حاصل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔:

؎ وقت جو گزارا ہے، لکھنؤ کی گلیوں میں
مختصر سہی لیکن، عمر بھر پہ بھاری ہے[۴۷]

اگرچہ نہ چاہتے ہوئے بھی بسلسلۂ روزگار انہیں لکھنو چھوڑنا پڑا مگر اس سرزمین سے ان کا رشتہ ہمیشہ قائم رہا۔ وہاں کی مخصوص شعری و ادبی فضا سے دوری کا رنج ہمیشہ انہیں ستاتا رہا۔ یہ کرب ان کے درج ذیل شعر میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے:

؎ پہلے دلی چھٹی، پھر چھٹا لکھنؤ، لطفِ صحبت ہی اقبالؔ جاتا رہا
اب وہ باتوں میں پھولوں کی خوشبو کہاں، اب وہ شیرینیٔ قندِ اردو کہاں[۴۸]

سرکاری ملازمت کے آغاز ہی میں انہیں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ حمیر پور (جہاں وہ پہلے پہل تعینات کیے گئے) دریائے جمنا اور دریائے بیدوا کے درمیان سطح سمندر سے سینکڑوں فُٹ کی بلندی پر واقع ایک عجیب و غریب بستی تھی جس میں دورِ جدید کی کوئی بھی سہولت میسر نہ تھی۔ وہاں سے قریب ترین ریلوے سٹیشن کان پور میں تھا جو چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔ حمیر پور کے علاوہ انہوں نے ملازمت کے سلسلے میں مہوبہ، باندھہ، کان پور، بارہ بنکی، سلطان پور الہ آباد، فیض آباد، گورکھ پور اور بنارس میں بھی کچھ عرصہ قیام کیا۔

اسی دوران برِ صغیر کا سیاسی منظر نامہ تیزی سے تبدیل ہونے لگا۔ ہندوستان کے عوام انگریزوں کے ظلم و بربریت سے تنگ آکر بغاوت پر اتر آئے تھے اور ہر حال میں برطانوی تسلط سے آزادی کے خواہاں تھے۔ علاوہ ازیں جنگِ عظیم دوم کے بعد معیشت کمزور ہو جانے کے سبب یوں بھی متحدہ ہندوستان پر انگریزوں کی گرفت خاصی ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ لہذا ان کے لیے برِ صغیر کی آزادی ناگزیر تھی۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں میں حصولِ آزادی کے حوالے سے شدید اختلاف تھا۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان کسی بات پر سمجھوتہ نہ ہونے کے باعث اختلافات کا سلسلہ شدت اختیار کر

گیا اور جا بجا ہندو مسلم فسادات برپا ہونے لگے۔ برِ صغیر کی کشیدہ تر صورتحال کے پیشِ نظر برطانیہ کو جلد ہندوستان کی آزادی کا فیصلہ کرنا پڑا۔

اس تقسیم کے نتیجے میں افراد کی ایک بہت بڑی تعداد نے ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان ہجرت کی۔ ان مہاجرین کو دورانِ ہجرت بہت سی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ تقریباً دو کروڑ افراد بے گھر ہوئے، بیس لاکھ سے زائد قیمتی انسانی جانیں لقمۂ اجل بنیں اور بے شمار خاندان اپنے عزیز و اقارب سے ایسے بچھڑے کہ دوبارہ کبھی ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکے۔ بقول نبی احمد:

> ۱۹۴۷ء میں برصغیر کو آزادی ملی جس کا خیر مقدم سب نے کیا مگر آزادی کے ساتھ ہی وحشت و بربریت اور قتل و غارت گری کا جو بے پناہ سیلاب امڈ آیا اس نے آزادی کی خوشی کو غم اور آزادی کے اجالے کو دھندلا کر دیا۔ صبح کی روشنی تاریکی میں تبدیل ہو گئی کیونکہ اس آزادی کے پیغام نے جہاں کروڑوں لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دی وہیں ہزاروں لوگوں کی موت کے پروانے پر دستخط بھی کر دیئے۔[۴۹]

عوام کے ساتھ ساتھ بہت سے شعرا و ادبا کو بھی اس صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ معاشرے کے حساس ترین افراد ہونے کی بنا پر انہوں نے نہ صرف ہجرت کی ہولناکیوں، خانہ بدوشی کی تلخیوں، بے سروسامانی کی کیفیات، ترکِ وطن کے کرب، عزیز و اقارب سے دوری اور اجنبیت کے دکھ کو شدت سے محسوس کیا بلکہ ان تجربات کو اپنی تحریروں اور شاعری کا موضوع بھی بنایا۔ پروفیسر آل احمد سرور اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> تقسیم کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں نفرت کے جو حیرت انگیز مظاہرے اور فسادات کی وجہ سے جو انسانیت سوز منظر دیکھنے میں آئے ان کے خلاف سب سے پر زور آواز اردو کے افسانہ نگاروں اور شاعروں کی ہے۔[۵۰]

قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبد اللہ حسین، خدیجہ مستور، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی، جیسے ادبا نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں مختلف زاویوں سے ہجرت کے دل خراش مناظر کی تصویر کشی کی ہے۔ ناولوں میں "آگ کا دریا" از قرۃ العین حیدر، "آگے سمندر ہے" از انتظار حسین، "اداس نسلیں" از عبد اللہ حسین اور "آنگن" از

خدیجہ مستور خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ جبکہ کرشن چندر کا افسانہ "پشاور ایکسپریس" منٹو کے افسانے "ٹوبہ ٹیک سنگ، شریفن اور کھول دو" اور احمد ندیم قاسمی کے افسانے "پرمیشور سنگھ" میں بھی ہجرت و فسادات کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ان موضوعات پر قلم اٹھانے والے ادبا میں انتظار حسین کو خاص انفرادیت حاصل ہے۔ وہ ہجرت سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ہجرت تو انسان کی تاریخ ہے۔ جنتؑ کی ہجرت سے لے کر آج تک کی ہجرت تک انسان نے جس جس طرح ہجرت کی ہے، دیس چھوڑے ہیں اور دیس بسائے ہیں، جب تک ان کا کوئی عکس تہ میں جاری و ساری نہ ہو تو پھر وہ ہجرت کی داستان کیا ہوئی؟[۵۱]

مذکورہ ادبا کے ساتھ ساتھ بہت سے شعرا نے بھی ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی۔ انہوں نے ہجرت کے دکھ درد، سفر کی صعوبتوں، لوٹ مار، قتل و غارت گری، لٹے پھٹے قافلوں کی حالتِ زار، کیمپوں میں مہاجرین کی بے سر و سامانی، فاقہ کشی اور بیماریوں کا احوال اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ ان شعرا میں حفیظؔ جالندھری، اخترؔ شیرانی، صباؔ اکبر آبادی، فیض احمد فیضؔ، تابشؔ دہلوی حفیظؔ ہوشیارپوری، محشرؔ بدایونی، ضیاؔ جالندھری، منیرؔ نیازی، اداؔ جعفری، شہرتؔ بخاری، امیدؔ فاضلی اور ناصرؔ کاظمی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ناصرؔ کاظمی نے اپنے والدین اور عزیز و اقارب کے ہمراہ انبالہ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی اور لاہور کو اپنا مسکن بنایا۔ انہوں نے ہجرت کے دوران بہت سے صدمات اٹھائے اور ان کا گہرا اثر قبول کیا۔ ڈاکٹر حسن رضوی لکھتے ہیں:

> ہندو، جاٹوں اور سکھوں کے جتھے مسلمانوں کے قافلوں پر جگہ جگہ حملہ آور ہو رہے تھے۔ جہاں کہیں نہتے مسلمانوں کو دیکھتے، انہیں لوٹتے بھی اور تہِ تیغ بھی کرتے۔ بہت سی مسلمان عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں، بہت سی مسلمان خواتین کو اغوا کر لیا گیا۔ ظلم و بربریت کی یہ ہولی جگہ جگہ پر مسلمانوں کے خون سے کھیلی جا رہی تھی۔ وہ لوگ جو صدیوں سے ایک جگہ، ایک مقام پر اکٹھے رہتے چلے آ رہے تھے، ایک دوسرے کے تہواروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ یہ سارا منظر ناصرؔ کاظمی کی آنکھوں کے سامنے تھا۔[۵۲]

تقسیم ہند کے سانحے کے بعد آزادی تو حاصل ہو گئی لیکن یہ آزادی بہت خوف ناک اور درد و غم سے لبریز تھی۔ ہجرت سے قبل ہونے والے فسادات اور لوٹ مار، دورانِ ہجرت سفر کی مشکلات اور پھر نئے وطن میں مہاجرین کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا، ان کی بازگشت ہمیں ناصر کے کلام میں بخوبی سنائی دیتی ہے۔ مثلاً

؎ شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے[۵۳]

؎ انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں[۵۴]

؎ اتنی خلقت کے ہوتے
شہروں میں ہے سناٹا
فصلیں جل کر راکھ ہوئیں
نگری نگری کال پڑا[۵۵]

ایسے ہی صدمات سے اقبال عظیم کو بھی دوچار ہونا پڑا، جب ۱۰ جولائی ۱۹۵۰ء کی ایک فیصلہ کُن شام کو ان سے اودھ کی گلیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان سے چھن گئیں اور سرزمینِ مشرقی پاکستان ان کا مقدر ٹھہری۔ وطن سے دائمی جدائی اور دربدری کے احساس نے انہیں توڑ کر رکھ دیا۔ اقبال عظیم کے درج ذیل اشعار ان کی اسی کیفیت کے غماز ہیں:

؎ جب راس ہی نہ آیا، گلشن کا آب و دانہ
تو کیسا آشیانہ، اور کس کا آشیانہ[۵۶]

؎ مقدر ہو گئی خانہ بدوشی
نہ جانے کس گھڑی نکلے تھے گھر سے[۵۷]

اقبال عظیم کی زندگی کا دوسرا اور اہم دور مشرقی پاکستان ہجرت کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس دوران انہیں بہت سے دکھ اٹھانا پڑے۔ ان دکھوں کا احوال بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> بعد کی زندگی سے مراد ۱۹۵۰ء کے بعد کی زندگی ہے۔ جس کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہے۔ بیس برسوں پر پھیلی ہوئی اس زندگی کا احوال لکھنے بیٹھوں تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں گے۔ اس لیے طویل داستان کے صرف جلی عنوانات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان عنوانات میں ترکِ وطن کا کرب، خانہ بدوشی کی تلخیاں، غریب الوطنی کی مصیبتیں، اس سرِ نَو زندگی کا آغاز، نئے ہم وطنوں کا سلوک، اہلیہ کا انتقال، تین چھوٹے بچوں کی پرورش کی نازک ذمہ داری، بینائی کا زیاں، اس زیاں کے بعد ملازمت کی پیچیدگیاں، لسانی اور صوبائی عصبیت، مہاجر کُشی، سیاسی انتشار، قبل از وقت پینشن، دوسری ہجرت، تیسری وطنیت اور چند عزیزوں اور پرانے دوستوں کی نوازشیں شامل ہیں۔[۵۸]

مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران وہ ان گنت آلام و مصائب کا شکار رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کی سیاست میں شروع ہی سے تعصب کے رنگ کو شامل کر دیا گیا تھا۔ غیر بنگالیوں اور مہاجرین کے لیے حالات انتہائی ناسازگار تھے۔ بنگالیوں کی زبانوں پر طعنے اور لبوں پر شکوے تھے۔ ان کی آنکھوں میں غیر بنگالیوں کے لیے نفرت صاف دکھائی دیتی تھی۔ اس میں بہت کچھ عمل دخل اس وقت کی سیاسی قیادت کا بھی تھا جو ایک خاص منصوبے کے تحت بنگالی قومیت، صوبائی عصبیت اور لسانی تفرقات کو ہوا دے کر جلتی پر تیل کا کام کر رہی تھی۔ بقول صدیق سالک:

> وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بنگالی قومیت کی وبا تیز ہوتی جا رہی تھی۔ شہری اور فوجی طبقے اس کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔ اس کو مزید ہوا دینے کے لیے عوامی لیگ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ وہ ہر اس تقریب سے سرد مہری اور بیگانگی برتتی، جس سے قومی یکجہتی کو تقویت ملتی تھی اور ہر اس موقعے کو اہمیت دیتی، جس سے صوبائی عصبیت کو فروغ حاصل ہوتا۔[۵۹]

بگڑتی ہوئی اس تکلیف دہ صورتِ حال کا اندازہ کوئی بھی ذی شعور با آسانی کر سکتا تھا۔ اقبال عظیم تو پھر ایک حساس شاعر تھے۔ انہوں نے جو دیکھا اور محسوس کیا، اسے شعوری و لاشعوری طور پر اپنی غزلوں کا موضوع بنایا۔ اپنے ہی وطن میں اجنبیت کے احساس نے انہیں بے حد رنجور کیا۔ ان کے درج ذیل اشعار اسی احساس کے ترجمان ہیں:

؎ اس دیارِ غیر میں وہ لٹ چکی مدت ہوئی
جس کو خوش فہمی سے اب تک آبرو کہتے ہیں لوگ[۶۰]

؎ تم نے ہم جیسے مسافر بھی نہ دیکھے ہوں گے
جو بہاروں سے چلے اور خزاں تک پہنچے[۶۱]

افسوس ناک بات یہ ہے کہ دو قومی نظریے کی بنیاد اور اسلام کے نام پر حاصل کیے جانے والے اس ملک میں قوم رنگ و نسل اور صوبائی و لسانی بنا پر تقسیم کا شکار تھی۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آنے والے غیر بنگالیوں کو ہمیشہ مہاجر ہی سمجھا گیا۔ اقبال عظیم اپنے ہی ہم وطنوں کے اس ناروا سلوک سے بہت مایوس ہوئے۔ ان کے اندر کا حساس دل تخلیق کار ان کی سرد مہری، تلخ رویوں اور نظروں اور الفاظ سے عیاں ہونے ولی نفرت کی تاب نہ لا سکا اور پکار اٹھا:

؎ نظریں بدل گئی تھیں، تو کچھ ایسا غم نہ تھا
ذہنوں کے زاویے بھی بدلتے چلے گئے[۶۲]

؎ دور میں اوروں کی خاطر، پیمانوں پر پیمانے ہیں
سارے مے خانے میں جیسے، اِک ہم ہی بیگانے ہیں[۶۳]

؎ وہ ملنے کو ملتے تو ہیں ہم سے لیکن
بڑی بے دلی سے، بڑی بے رخی سے[۶۴]

اس سب کے باوجود اقبال عظیم نے نئے عزم کے ساتھ ڈھاکہ میں تدریسی سلسلے کا آغاز کیا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر اندلیب شادانی کے مشورے پر ۱۹۵۱ء میں ریسرچ سکالر کی حیثیت سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخلہ بھی لے لیا۔ تحقیقی مقالے کی تکمیل کی معیاد دو سال تھی اور ضابطے کے مطابق ڈھاکہ میں ایک سال کا قیام ضروری تھا۔ مگر ستم یہ ہوا کہ جب ایک سال

مکمل ہونے میں صرف ایک ماہ باقی رہ گیا تو ان کا تبادلہ چٹا گانگ کر دیا گیا اور انہیں اپنا تحقیقی کام ادھورا چھوڑ کر وہاں جانا پڑا۔

چٹا گانگ میں وہ پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے تدریسی فرائض سر انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۲ء میں حکومتِ مشرقی پاکستان کی جانب سے انہیں سینئیر ایجوکیشن سروس میں شامل کر لیا گیا۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود اقبال عظیم اور ان کے اہلِ خانہ کا گزر بسر بہ مشکل ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اضافی محنت کرتے تھے۔

؎ اپنے ہاتھوں آرزوؤں کا گلا گھونٹا کیے
زندہ رہنے کے لیے ہم خودکشی کرتے رہے[۶۵]

ان کی شریکِ حیات ٹی بی کے عارضے میں مبتلا تھیں۔ ان کی تیمار داری اور علاج معالجے کے اخراجات کا بوجھ بھی انہیں خود برداشت کرنا پڑتا تھا۔ سید ابوالخیر کشفی اس ضمن میں رقم طراز ہیں: "اقبال عظیم (مرحوم) امتحانی کاپیاں جانچتے اور اپنی مریض شریکِ حیات کی تیمارداری کرتے ہوئے اپنی راتوں کو صبح میں بدلتے ہوئے دیکھتے تھے[۶۶]" ۱۹۶۲ء میں انہیں اس وقت ایک بہت بڑے صدمے سے دوچار ہونا پڑا، جب شدید علالت کے بعد ان کی اہلیہ زینت جہاں کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کے بڑے صاحبزادے شاہین اقبال کی عمر سترہ برس، بڑی صاحبزادی تسکین اقبال کی عمر بارہ برس اور چھوٹی بیٹی فردوس اقبال کی عمر صرف نو سال تھی۔ بیوی کی وفات کے بعد بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا سارا بوجھ انہیں پر آن پڑا۔ احباب نے دوسری شادی کا مشورہ دیا مگر وہ اس لیے نہ مانے کہ انہوں نے اپنی مرحوم اہلیہ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنی بچیوں کو کسی غیر عورت کے حوالے نہیں کریں گے۔ انہوں نے تمام عمر اس وعدے کا پاس رکھا اور کبھی اپنے بچوں کو ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ نہ صرف ان کی تعلیم و تربیت کا فریضہ بطریقِ احسن انجام دیا بلکہ معذوریٔ چشم کے باوجود ان کی شادیوں کے انتظامات بھی اپنی نگرانی میں کروائے۔ بقول تسکین اقبال عظیم:

> میرے والد نے ہم بہن بھائیوں کو انتہائی شفقت سے پالا اور بیک وقت ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا۔ وہ ہر لحاظ سے ہمارا خیال رکھتے اور دل جوئی کرتے تھے۔ شادی کے مواقع پر وہ جہیز میں دیے جانے والی ان تمام اشیا کی فہرست مرتب کراتے جن کی ضرورت ہمیں پیش آسکتی تھی اور پھر ہمیں اپنے ہمراہ

بازار بھی لے جاتے تاکہ ہم اپنی پسند کی اشیا خرید سکیں۔ نفاست و سلیقہ شعاری بھی ہم نے انہیں سے سیکھی۔ یہ انہیں کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ ہم دونوں بہنوں کو اپنے اپنے سسرال میں آج بھی مثالی قرار دیا جاتا ہے۔[۶۷]

۱۹۶۳ء میں اقبال عظیم کو محسوس ہونے لگا کہ ان کی بینائی تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر کے معائنہ کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ گلوکومہ (Glaucoma) آنکھوں کے بلڈ پریشر کے عارضے میں مبتلا ہیں۔ لہٰذا ان کی بائیں آنکھ تو مکمل طور پر خراب ہو چکی ہے۔ البتہ دائیں آنکھ علاج سے ٹھیک ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً علاج شروع کرا دیا اور اس سے کسی قدر بہتری بھی پیدا ہوئی۔ لیکن ۱۹۶۵ء میں انہیں ایک بار پھر شدید درد محسوس ہوا۔ درد کی شدت اس قدر تھی کہ ڈھاکہ کے ایک مقامی سرجن کو فوری طور پر ان کا آپریشن کرنا پڑا۔ یہ آپریشن ناکام رہا اور ان کی بینائی بالکل معمولی رہ گئی۔ اس کے بعد انہوں نے سیالکوٹ، کراچی اور لندن سے بھی آنکھوں کے آپریشن کروائے مگر ایک بھی کامیاب نہ ہوا۔ بائیں آنکھ کی بینائی تو مکمل ختم ہو گئی جبکہ دائیں آنکھ سے بڑے نمبر کی عینک لگا کر انتہائی نزدیک سے معمولی سا دکھائی دیتا رہا۔ ۱۹۸۵ء میں ان پر وقفے وقفے سے فالج کے دو شدید حملے ہوئے۔ ان حملوں سے وہ بہ مشکل جانبر تو ہو گئے مگر ان کی بینائی مکمل ختم ہو گئی۔

یہ امر خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ اقبال عظیم پیدائشی نابینا نہیں تھے۔ انہوں نے نہ صرف پچاس سال دنیا اور اس کی رنگینیوں کو ظاہری آنکھوں سے دیکھا بلکہ اس کا بغور مشاہدہ بھی کیا۔ دوسرا یہ کہ ان کی بینائی اچانک نہیں بلکہ وقفے وقفے سے ختم ہوتی رہی۔ ہر آپریشن وہ یہی سوچ کر اور اسی امید پر کرواتے رہے کہ شاید اب کی بار ان کی بینائی لوٹ آئے اور وہ پھر سے دیکھنے اور اپنے جملہ فرائض صحیح طور پر انجام دینے لگیں۔ مگر ہر بار انہیں ایک نیا دھچکا لگا اور نئے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ معمولی بینائی کو بھی غنیمت سمجھتے تھے۔ مگر جب یہ بھی نہ رہی تو وہ بے حد رنجور ہوئے۔ اپنے اس غم کا پُر درد اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

؎ روشنی کم تھی، مگر اتنا اندھیرا تو نہ تھا
شمعِ امید بھی گُل ہو گئی جلتے جلتے[۶۸]

؎ مری زندگی کے چراغ کا، یہ مزاج کوئی نیا نہیں
ابھی روشنی، ابھی تیرگی، نہ جلا ہوا، نہ بجھا ہوا[۶۹]

وہ شخص جسے رب العزت نے بینائی جیسی نعمت عطا کی ہو اور وہ اپنی عمر کی تقریباً پچاس بہاریں چشمِ بینا سے دیکھ بھی چکا ہو، اچانک اس سے یہ نعمت چھن جائے تو اس شخص کی حالت کیا ہو سکتی ہے۔ اقبال عظیم نے بے بصری کے اس کرب کو شدت سے محسوس کیا اور اپنی شاعری میں جابجا اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ مثلاً:

؎ آنکھوں سے نور، دل سے خوشی چھین لی گئی
ہم سے ہماری زندہ دلی چھین لی گئی[۷۰]

؎ دیکھی پھر اس کے بعد نہ آنکھوں نے روشنی
اِک رات غم کدے میں چراغاں ہوا تو تھا[۷۱]

بد قسمتی سے ہم جس معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں اس میں معذور افراد کے حوالے سے دو رویے رائج ہیں۔ یا انہیں مکمل طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، یا ضرورت سے زیادہ ہمدردی جتا جتا کر مظلوم قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب ایک معذوری کے حامل کسی عام فرد کے لیے بھی یہ دونوں انتہائیں قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں تو پھر اقبال عظیم جیسے دانشور اور غیور و خوددار شاعر کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ کوئی ان پر ترس کھائے اور بے جا غم گساری کرے۔ اس رویے سے بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

؎ چاہتا یہ ہوں کہ دنیا مجھ کو تنہا چھوڑ دے
جانے کیوں اب غم گساری سے بھی گھبراتا ہوں میں[۷۲]

؎ اِک آہ تو کر لی ہے، مگر سوچ رہا ہوں
پہچان نہ لی ہو مری آواز کسی نے[۷۳]

میری معذوری پہ دشمن بھی ترس کھاتے رہے
یوں سرِ بازار رسوا آبرو ہوتی رہی[۴۴]

یہ مری انا کی شکست ہے، نہ دوا کرو، نہ دعا کرو
جو کرو تو بس یہ کرم کرو، مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو[۴۵]

اگرچہ اقبالؔ عظیم کے مزاج میں خودداری بدرجۂ اتم موجود تھی۔ لیکن اس کے باوجود معذوریٔ چشم کی بنا پر انہیں بہت سے امور کی انجام دہی بالخصوص کہیں آنے جانے کے لیے کسی بینا شخص کی معاونت ضرور حاصل کرنا پڑتی تھی اس لیے کہ وہ اپنی مرضی سے خود کہیں بھی آنے جانے سے قاصر تھے۔ اپنی اس مجبوری کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "معذروئ چشم کے سبب میں سچ مچ نظر بند ہوں اور کہیں آنے جانے میں دوسروں کا محتاج"[۴۶] اقبالؔ عظیم اور معروف یونانی شاعر جان ملٹن میں اس اعتبار سے ایک مماثلت پائی جاتی ہے کہ وہ بھی اپنی عمر کے نصف حصے میں بصارت سے محروم ہو گیا تھا۔ اس کی دو شہرۂ آفاق منظومات Paradise Lost (جنتِ گم گشتہ) اور Paradise Regained (جنتِ بازیافتہ) اس سانحے کے بعد ہی تخلیق ہوئیں۔ اس محرومی نے ملٹن کو جو درد، ٹیس اور کسک عطا کی اس کا اندازہ اس کی اس مشہور سانٹ On His Being Blind سے لگایا جا سکتا ہے۔ جس میں وہ اللہ سے کہتا ہے کہ وہ بھی تیرے ہی بندے ہیں، جو مجبور اور لاچار پا شکستہ پڑے ہیں اور قافلۂ حیات کو بڑھتا محسوس کر سکتے ہیں۔ مگر ساتھ نہیں دے سکتے۔

اقبالؔ عظیم کی شاعری میں بھی غمِ بے نگاہی کو بے پناہ اہمیت حاصل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ظاہری آنکھوں کی روشنی چھن جانے سے ان کی چشمِ بصیرت روشن تر ہو گئی ہے تو غلط نہ ہو گا۔ اس احساس سے ان کی غزلوں میں جو درد، غم اور کسک پیدا ہوئی ہے اس نے ان کی شاعری کو ایک نئی فکری جہت سے آشنا کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں بے نگاہی، کم نگاہی، بے بصری، دیدہ وری، چراغ، روشنی اور نور جیسے الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ اقبالؔ عظیم نے بھی ملٹن کی طرح احساسِ بے نگاہی سے پورا پورا انصاف ہے اور ان الفاظ کو نئے مفاہیم عطا کیے ہیں۔ مثلاً:

گل کر دیے چراغ کسی نے تو کیا ہوا
اب روشنی سے ہم کو سروکار بھی نہیں[۴۷]

کس عافیت سے وقت گزرتا ہے ان دنوں
ان ظلمتوں میں چاند ستاروں سے دور دور[۷۸]

ہمارے غم کدے تک روشنی پہنچے تو ہم جانیں
ستارے آسماں پر جگمگائے بھی تو کیا ہو گا[۷۹]

ایک اور محرومی جس کا قلق اقبال عظیم کو تادمِ وفات رہا وہ ترنم کا چھن جانا تھا۔ اللہ رب العزت نے انہیں انتہائی دل کش ترنم عطا کیا تھا۔ وہ اپنے کلام اور ترنم کی بدولت مشاعروں پر چھا جاتے اور سامعین پر سحر طاری کر دیا کرتے تھے۔ نذیر صدیقی ان کے مترنم لہجے کی بابت لکھتے ہیں:

> میں نے اپنی زندگی میں ان سے پہلے ان سے بہتر ترنم نہیں سنا تھا اور اب جبکہ گزشتہ ستائیس سال کے اندر پاکستان اور ہندوستان کے بہت سے شاعروں کا ترنم سن چکا ہوں، اب بھی یہی کہوں گا کہ مجھے اپنی زندگی میں جن دو تین شاعروں کا ترنم بے حد پسند آیا ہے ان میں سے ایک اقبال عظیم کا ترنم بھی ہے۔[۸۰]

افسوس کہ فالج کے پے در پے حملوں نے بینائی کے ساتھ ساتھ انہیں ترنم جیسی نعمت سے بھی محروم کر دیا۔ طبیعت میں بہتری واقع ہونے کے بعد وہ مشاعروں میں شریک تو ہوئے مگر ترنم سے کلام نہیں پڑھ سکے۔ یہ بات اقبال عظیم کو شدید مغموم کر دیتی تھی۔ شاہین اقبال عظیم ان کی اس محرومی کے حوالے سے رقم طراز ہیں: "ان فالج کے حملوں نے ان کے جسمانی اعضا کو تو مفلوج نہیں کیا، لیکن ان کا ترنم فالج کے زیرِ اثر آیا اور وہ اشعار سنانے کے قابل نہیں رہے۔ اس معذوری کا انہیں آخری وقت تک بڑی شدت سے احساس تھا۔[۸۱]" صدمات کی اس یورش کے باوجود ۱۹۶۵ سے ۱۹۷۰ء تک وہ آن ڈیپوٹیشن "عاریتاً سینئر ریسرچ آفیسر کے طور پر سیکرٹریٹ مشرقی پاکستان میں کام کرتے رہے۔ لیکن جب انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ بینائی کے زیاں کے باعث ملازمت میں پیچیدگیاں شدت اختیار کرنے لگی ہیں اور اب اسے مزید جاری رکھنا ممکن نہیں تو انہوں نے ۱۹۷۰ء میں قبل از وقت استعفٰی دے دیا۔

دوسری جانب مشرقی پاکستان کے حالات دن بدن کشیدہ تر ہوتے چلے جارہے تھے۔ اقبال عظیم نے سیلاب کے رُخ کو بہت پہلے ہی سے محسوس کر لیا تھا۔ انہیں بہت اچھی طرح یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وطنِ عزیز کے ساتھ سنگین مذاق کیا جارہا ہے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ صوبائی عصبیت کا جو زہر گھولا گیا ہے وہ انجام کار اپنا رنگ ضرور دکھائے گا۔ لہٰذا انہوں نے سقوط ڈھاکہ سے پہلے ہی ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔

؎ بات اب منزلِ تشہیر تک آ پہنچی ہے جستہ جستہ
اب بجز ترکِ تعلق کوئی رستہ ہی نہیں ہے شاید[۸۲]

ملازمت سے سبک دوشی کے بعد حکومتِ مشرقی پاکستان نے ان کے لیے ۴۳۳ روپے، ۵۰ پیسے پینشن مقرر کی، جسے مغربی پاکستان منتقل کرالیا گیا۔ حکومتِ پاکستان سے کئی بار اس میں اضافے کی درخواست کی گئی مگر ان کی یہ عرضی منظور نہ ہوئی۔

اقبال عظیم کو مشرقی پاکستان سے بے حد محبت تھی۔ اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام "مضراب" کا انتساب ہی "مرحوم مشرقی پاکستان" کے نام کیا۔ وہاں قیام کے دوران انہوں نے بہت سی علمی و ادبی اور تحقیقی و تصنیفی خدمات سرانجام دیں۔ فرحت پروین ملک ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: "سانحۂ مشرقی پاکستان کے حوالے سے اردو شاعری پر کام کرنے والے اقبال عظیم صاحب کو نظر انداز نہیں کر سکتے"[۸۳] اقبال عظیم نے انتہائی تن دہی کے ساتھ آسان اردو زبان میں کتابیں لکھیں اور ان کے توسط سے بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی۔ مشرقی بنگال میں اردو "دیوانِ ناطق لکھنوی"، "سات ستارے" متعدد نصابی کتب کی ترتیب و تدوین اور بنگالی افسانوں کے اردو تراجم پر مشتمل کتب پر نظر ثانی وغیرہ ان کے اہم کارہائے نمایاں ہیں۔ اپنی ان کاوشوں کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> میں نے مشرقی پاکستان میں اپنی زندگی کے بیس سال اردو زبان کے ایک رضاکار کی حیثیت سے گزارے اور میری تمام علمی اور ادبی صلاحیتیں اس صوبے میں صرف اردو زبان و ادب کے استحکام اور تبلیغ و اشاعت کی کوششوں میں سرف ہوئیں۔[۸۴]

لیکن افسوس کہ اقبالؔ عظیم کی یہ کوششیں بے سود اور ناکام رہیں۔ اس لیے کہ لوگوں میں صوبائی و لسانی عصبیت کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی چلی گئی اور خود اقبالؔ عظیم کے لیے زندگی اس قدر صبر آزما ہو گئی کہ انہیں مشرقی پاکستان چھوڑنا پڑا۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی انہیں پر درد کیفیات کے ترجمان ہیں، جن سے انہیں وہاں قیام کے آخری دنوں میں گزرنا پڑا:

ٹوٹے ہوئے تاروں کو ابھی جوڑ رہا تھا
ہاتھوں سے مرے چھین لیا ساز کسی نے[۸۵]

ظلم سے ہم ڈر گئے، یہ تم سے کس نے کہ دیا
ظلم قانوناً روا ہو جائے تو ہم کیا کریں
شکوہ سنجی کی ہمیں اقبالؔ عادت تو نہیں
زندگی صبر آزما ہو جائے تو ہم کیا کریں[۸۶]

اقبالؔ عظیم کو دوسری بار اپنی مرضی کے خلاف ہجرت کی اذیت سے دوچار ہونا پڑا۔ اب کی بار بھی انہیں اپنے عزیز و اقارب اور احباب کی جدائی برداشت کرنا پڑی۔ سفر کی صعوبتیں، غریب الوطنی کا کرب اور اجنبیت و بیگانگی کا احساس اب کی بار پہلے سے زیادہ شدید اور تکلیف دہ تھا۔ اس لیے کہ اب کی بار وہ اپنی وفا شعار اہلیہ اور بینائی جیسی عظیم نعمت کھو کر مغربی پاکستان جا رہے تھے۔ سید ابو الخیر کشفی انہیں تہری ہجرت کا شاعر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ان کی تینوں ہجرتیں، ہندوستان سے پاکستان، پاکستان سے پاکستان اور ہجرتِ ذات مل کر ان کی شخصیت اور شاعری کے سانچے میں ڈھل گئی ہیں اور ایک وحدت بن گئی ہیں۔ اس لیے میں نے انہیں تین ہجرتوں کا نہیں، بلکہ تہری ہجرت کا شاعر کہا ہے۔[۸۷]

دورانِ ہجرت انہوں نے بہت سے صدمات اٹھائے اور بے پناہ اذیتیں سہیں۔ ان اذیتوں کا کرب اپنی جگہ تھا مگر یہ اطمینان اپنی جگہ کہ وہ اپنے وطن جا رہے ہیں۔ جس کی آزاد فضاؤں میں وہ پر سکون زندگی گزار سکیں گے۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی انہی کیفیات کے ترجمان ہیں:

؎ یہ کون لوگ ہیں ،جو شوقِ سرفروشی میں
لہو لہو ہیں، مگر مسکرائے دیتے ہیں[88]

؎ گزر کے آنا پڑا اشک و خوں کی موجوں سے
ادا کیا ہے مگر حقِ دوستی ہم نے[89]

اقبالؔ عظیم کے ہاں جہاں غریب الوطنی کی کڑی دھوپ کی شدت کا احساس ہوتا ہے وہیں ایک صحت مند سیاسی شعور بھی ملتا ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ ہمیشہ ہی سے بد امنی اور انتشار کا شکار رہی ہے۔ یہی انتشار سقوط ڈھاکہ کا باعث بنا۔ اقبالؔ عظیم کو بخوبی اندازہ تھا کہ پاکستان کی قیادت جن رہنماؤں کے ہاتھ میں ہے، وہ اس کی حفاظت نہیں کر سکیں گے۔ لہذا وہ اس سانحے سے قبل ہی پکار اٹھے:

؎ خدا بچائے، گلستاں کو باغ بانوں سے
یہ گُل فروش ہیں، ان میں کسی کا ٹھیک نہیں[90]

اور بالآخر ہوا وہی، جس کا خدشہ تھا۔ یعنی مشرقی پاکستان ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔ اس کرب ناک سانحے پر ہر آنکھ اشک بار تھی۔ سقوط ڈھاکہ کے روح فرسا واقعے نے جہاں پوری قوم کو غمگین کر دیا، وہاں اقبالؔ عظیم جیسے محبِ وطن شاعر کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ چنانچہ ان کا فوری ردِ عمل کچھ یوں تھا:

؎ بستیاں خاموش ہیں، خلقِ خدا خاموش ہے
راستے ویران ہیں، ساری فضا خاموش ہے
ایک ایسا سانحہ پیش آ گیا ہے راہ میں
کارواں تو کارواں، خود رہنما خاموش ہے
پا شکستہ ہو کے یوں بیٹھا ہے سارا قافلہ
دم بخود ہیں منزلیں، بانگِ درا خاموش ہے[91]

اس سانحے کو بعض افراد نے تقدیر کا لکھا قرار دینے کی کوشش کی۔ مگر اقبال عظیم یہ ماننے کو تیار نہیں۔ ان کے خیال میں یہ سب ہمارا اپنا کیا دھرا ہے۔ ہم نے آزادی ہی کو اپنی آخری منزل سمجھ لیا جو ہماری بہت بڑی بھول تھی۔ لہٰذا اس خطا کی سزا تو ملنا ہی تھی۔ اس حوالے سے وہ اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ تم نے خود آگ لگائی ہے چمن میں اپنے
بے سبب گردشِ ایام کو الزام نہ دو
عین مقصود سمجھ بیٹھے تھے آغاز کو تم
اب اس آغاز کے انجام کو الزام نہ دو[۹۲]

اقبال عظیم کو اس بات کا بھی شدید دکھ تھا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں بیگانوں کے علاوہ بہت سے اپنے بھی شریک تھے، جنہوں نے وطن سے غداری کی اور اپنے ناپاک عزائم اور بد اعمالیوں سے اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ ایسے غداروں پر افسوس کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

؎ جو لوگ شریکِ سازش تھے، ہم نام بھی ان کا کیسے لیں
کچھ ان میں دوست پرانے تھے، کچھ باعزت ہمسائے تھے[۹۳]

اقبال عظیم کی بینائی بھی مشرقی پاکستان ہی میں ختم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ لیکن انہیں بصارت سے محرومی کا اتنا رنج نہیں تھا جتنا پاکستان کے دولخت ہونے کا۔ ان کا درج ذیل شعر ان کے اسی اندرونی کرب کا ترجمان ہے:

؎ میں کہاں سے لاؤں وہ روشنی، جو کسی کے شہر میں لٹ گئی
وہ کسی کا شہر بھی لٹ گیا، مجھے اس کا اور ملال ہے[۹۴]

انہوں نے اس غم کو فراموش کرنے کی بہت کوشش کی مگر ہمیشہ ناکام رہے۔ مشرقی پاکستان سے ان کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ وہاں کے ذکر سے ان کے زخم تازہ ہو جاتے تھے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ کوئی ان کے سامنے اس سانحے کا تذکرہ نہ کرے۔

؎ اب تو آنسو بھی میرے پاس نہیں
بے سہاروں کا ذکر مت چھیڑو

چند یادیں ہیں جن سے وابستہ
ان دیاروں کا ذکر مت چھیڑو[95]

جو زخم بھر چکے ہیں، انہیں مت کریدنا
جو اپنا گھر تھا کیسے لٹا، یہ نہ پوچھنا[96]

ہندوستان اور بنگلہ دیش سے پاکستان آنے والے مہاجرین کا خیال تھا کہ غلامی کی رات ڈھلتے ہی ان کے مقدر کی سیاہی بھی مٹ جائے گی۔ نئے وطن میں آزادی کا سورج غربت و افلاس، ناانصافی، بدامنی اور انتشار کے خاتمے کی نوید بن کر ابھرے گا۔ سب کو زندگی کی بنیادی سہولیات یکساں طور پر میسر آئیں گی اور ہر سُو خوشحالی کا راج ہو گا۔ مگر جب انہیں اپنے یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے دکھائی نہ دیے تو ان میں غم و غصے اور مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ اس تکلیف دہ صورتِ حال کا سب سے زیادہ اور گہرا اثر ادبا نے قبول کیا۔ جان ایلیا اپنے مجموعۂ کلام "شاید" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> مجھے لاکھوں چراغوں کی روشنی میں اندھیرا دکھائی دے رہا تھا اور یہ وہ آزادی نہیں تھی جس کے خواب میں نے دیکھے تھے۔ میں نے خون میں لتھڑی ہوئی اس آزادی کا اپنے ذہن کی بدترین حالت میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔ ہم سب یہ سمجھتے تھے کہ آزادی کے بعد برِ صغیر جنت بن جائے گا۔ لیکن حقیقتِ حال یہ تھی کہ ہم آزادی کے جہنم میں جلنے کا ایک اشتعال انگیز دور شروع کر رہے تھے۔[97]

خوف و ہراس، سیاسی انتشار، لاقانونیت، معاشی بحران، معاشرتی عدم استحکام، قدروں کی شکست و ریخت، دربدری، بے سروسامانی، ذہنی کرب و اضطراب، احساسِ تنہائی اور ماضی پرستی اس دور کی غزل کے اہم موضوعات ہیں۔ ہجرت کی اذیت سے گزرنے والے شعرا نے جب یہ محسوس کیا کہ ان گنت قربانیاں دے کر جن مقاصد کی تکمیل کے لیے آزادی حاصل کی گئی تھی وہ پورے نہیں ہو رہے اور عوام مشکلات کی دلدل میں دھنستے ہی چلے جا رہے ہیں تو وہ تڑپ اٹھے:

بجلیوں کی یورش سے، شاخ شاخ لرزاں ہے
کیا یہی بہاراں ہے، کیا یہی گلستاں ہے[98]

"حبیب جالبؔ"

؎ یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں[99]

"فیضؔ"

اقبالؔ عظیم نے بھی ہجرت کرتے ہوئے پاکستان سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اپنے وطن میں ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا جائے گا، ان کی تمام محرومیاں ختم ہو جائیں گی اور وہ خوشیوں سے بھرپور زندگی گزاریں گے۔ لیکن ان کی یہ امیدیں پوری نہ ہوئیں۔ انہیں یہاں آکر یہ اندازہ ہوا کہ آزادی کے نام پر جو وعدے کیے گئے تھے وہ جھوٹ اور فریب پر مبنی تھے اور صبحِ آزادی محض سراب تھی۔ اس صورتِ حال پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

؎ فریبِ منزل کا راز افشاں ہوا ہے آکر قریبِ منزل
نظر تو آئی تھی دور سے کچھ سوادِ منزل پہ روشنی سی[100]

انہیں اس بات کا بھی بے حد رنج تھا کہ اپنا گھر بار لٹا کر وہ اسلام کے نام پر حاصل کیے جانے والے جس ملک میں وارد ہوئے تھے وہاں بھی بد امنی اور انتشار کا دور دوراں تھا، طبقاتی امتیازات عروج پر تھے، اور وہاں بھی کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں تھی۔ اپنے اس دکھ کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

؎ کوئی دامن ہے سلامت، نہ گریباں محفوظ
دعوٰئے بخیہ گری اپنی جگہ باقی ہے[101]

؎ نکلے تھے گھر سے جس کے تحفظ کے واسطے
مٹی میں مل گئی، وہ شرافت رہی سہی[102]

اور اس پر ستم یہ کہ انہیں اپنے وطن میں بھی بیگانگی کا سامنا کرنا پڑا۔ حالانکہ وہ ان گنت قربانیاں دے کر پاکستان پہنچے تھے۔ مگر افسوس کہ اپنے ہم مذہب، ہم زبان اور اپنے ہی ہم وطنوں نے ان کے ساتھ غیروں کا سا برتاؤ کیا اور انہیں پہچاننے تک سے انکار کر دیا۔ اپنوں کی اس ستم ظریفی پر وہ یوں نوحہ کناں ہیں:

؎ شریکِ محفل ہیں ہم بھی یوں تو، مگر باندازِ خود فریبی
مزاجِ محفل بھی اجنبی سا، نگاہِ ساقی بھی اجنبی سی[۱۰۳]

؎ جہاں بھی ہم نے صدا دی، یہی جواب ملا
یہ کون لوگ ہیں، پوچھو کہاں سے آئے ہیں[۱۰۴]

مستقل غم اور کربِ مسلسل کسی بھی انسان کو جھنجوڑ کر رکھ دینے کے لیے کافی ہے۔ مایوسی اور زندگی سے بیزاری اس غم کا لازمی اور فطری نتیجہ ہے۔ اقبالؔ عظیم نے بچپن سے وفات تک جس قدر دکھ اٹھائے اور صدمے برداشت کیے انہوں نے انہیں متزلزل کر کے رکھ دیا اور انتہائی غیور و خوددار ہونے کے باوجود ان کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ ویرانی، اداسی، تنہائی، زندگی سے فرار اور کسی قدر قنوطیت کا عنصر ان کی غزلوں کے متعدد اشعار میں واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً

؎ آدمی اس زندگی سے بچ کے جائے بھی کہاں
مے کشی بھی جرم ہے اور خود کشی بھی جرم ہے[۱۰۵]

؎ اس کو کیا کہتے ہیں اقبالؔ، کسی سے پوچھو
دل نہ اب شہر میں لگتا ہے، نہ ویرانے میں[۱۰۶]

؎ رات کے بعد سحر ہو گی، مگر کس کے لیے
ہم ہی شاید نہ رہیں رات کے ڈھلتے ڈھلتے[۱۰۷]

یہ کون سا عالم ہے، افسردہ مزاجی کا
گلشن میں بھی ویرانی، محفل میں بھی تنہائی[۱۰۸]

اقبالؔ عظیم کو غمِ جاناں، غمِ دوراں، غمِ بے نگاہی، اور غمِ ہجرت در ہجرت نے اس قدر رنجیدہ کر دیا کہ سنجیدگی ان کی ذات کا مستقل حصہ بن گئی۔ افسردگی مزاج پر اس قدر غالب آئی کہ یا تو انہیں ہنسی ہی نہ آتی یا وہ جبراً مسکرانے کی کوشش کرتے تاکہ ان کے غم کی نقاب کشائی نہ ہونے پائے۔ ان کی غزلیات کے بہت سے اشعار ان کی ان کیفیات کے غماز ہیں۔ مثلاً

؎ اِک روز اتفاق سے ہم مسکرائے تھے
اس کی سزا میں ہم سے ہنسی چھین لی گئی[۱۰۹]

؎ آخری بار ہنسی آئی تھی کب یاد نہیں
اور پھر آئے ہنسی، اس کی تمنا بھی نہیں[۱۱۰]

؎ وہی اقبالؔ جس کو ناز تھا کل خوش مزاجی پر
نظر آتا ہے محفل میں بھی کچھ رنجیدہ رنجیدہ[۱۱۱]

اقبالؔ عظیم کی غزلیات کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ انہیں ہر لمحہ یہ خدشہ رہتا ہے کہ جو خوشی انہیں میسر آرہی ہے وہ بھی کسی غم ہی کا پیش خیمہ ہے۔ وہ اس خیال کے پیشِ نظر شمع امید روشن کرنے کی جسارت نہیں کرتے کہ جانے کب گُل ہو جائے۔ اور اس خوف سے متبسم نہیں ہوتے کہ کہیں یہ بھی وقت کی کوئی چال ہی نہ ہو جس کی پاداش میں انہیں اشک بار ہونا پڑے۔ ان کیفیات کا اظہار ان کے درج زیل اشعار میں کچھ یوں ملتا ہے:

؎ شمعِ امید جلائی تو ہے ڈرتے ڈرتے

بجھ گئی وہ بھی سر شام تو پھر کیا ہو گا
مسکراتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ ہو یہ بھی اگر
سازشِ گردشِ ایام تو پھر کیا ہو گا[۱۱۲]

اقبال عظیم کی غزلوں میں بھی اکثر مہاجر شعرا کی طرح ناسٹیلجیائی عناصر کثرت سے ملتے ہیں۔ وہ بار بار ماضی میں لوٹ کر اپنی زندگی کے بیتے دنوں، گزرے ہوئے لمحات اور شناسا لوگوں کو یاد کرتے ہیں۔ اپنے وطن سے دوری کا کرب شدت سے محسوس کرتے اور اسی کی خوش گوار فضاؤں میں سانس لیتے ہیں۔ بحران اور نفسا نفسی کے اس دور میں یادِ رفتگاں ہی ان کا سرمایہ ہیں۔ عالمِ تنہائی میں یادوں کا جہاں آباد کر لینے سے انہیں کبھی تو فرحت محسوس ہوتی ہے اور کبھی وہ شدید ذہنی کرب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی انہیں متنوع کیفیات کے عکاس ہیں:

؎ یادِ ماضی مری آنکھوں میں سمٹ آتا ہے
میں نے کچھ شہر بسا رکھے ہیں ویرانے میں[۱۱۳]

؎ جب دل پہ گراں گزری، ماحول کی خاموشی
بھٹکی ہوئی یادوں سے، ہونے لگی سرگوشی[۱۱۴]

؎ جب طبیعت غمِ امروز سے گھبراتی ہے
یادِ ماضی مری پرسش کو چلی آتی ہے[۱۱۵]

غالب کی طرح اقبال عظیم بھی اس آفاقی سچائی کے معترف ہیں کہ پے در پے آلام و مصائب سہنے سے انسان رنج سے خوگر ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب اسے اذیت میں راحت محسوس ہونے لگتی ہے اور اس کی مشکلات آسانی میں بدل جاتی ہیں۔ تمام عمر غم سے نبرد آزما رہنے سے اقبال عظیم کے مزاج میں صبر و ضبط، تسلیم و رضا، شکر گزاری، عزم و استقلال اور غیر معمولی خودداری پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے اثرات ان کی غزلوں کے اکثر

اشعار میں واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے نزدیک تقدیر کے لکھے پر شکوہ کناں ہونا خودداری کی توہین کے مترادف ہے۔ وہ کہتے ہیں:

؎ مثلِ گل دل خون ہے اقبال، لیکن شکر ہے
مثلِ شبنم گریۂ کم کم نہیں ہے کم سے کم[۱۶]

؎ شکوہ جو زباں پر آ ہی گیا، کیا آن رہی خودداری کی
تقدیر پہ شاکر ہے اپنی، اقبال سراپا غم ہی سہی[۱۷]

بحیثیت مجموعی اقبال عظیم کی غزلیں اسی روایت کا تسلسل ہیں جو فارسی شاعری کے زیرِ اثر پروان چڑھی اور جسے ولیؔ، میرؔ، دردؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فانیؔ اور ناصرؔ کاظمی وغیرہ نے آگے بڑھایا۔ لیکن اقبال عظیم کا غم روایتی موضوعاتی دائرے سے کسی حد تک مختلف ہے کیوں کہ وہ زندگی کو واقعات اور حادثات کے ساتھ جوڑ کر تخلیقی اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کا غم محض روایت سے جڑا ایک موضوع نہیں ہے۔ بلکہ یہ اپنے اندر ایک انفرادی کسک لیے ہوئے ہے، جو انہیں دیگر شعراء کے تصورِ غم سے ممتاز کرتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔صدام حسین، "کتھارسز، نفسیاتی صحت کے لیے"www.facebook.com، ۲۰۲۲ مئی ۱۵، ۱۰:۳۰am

۲۔اکرام الحق، "ادب میں المیہ"www.muqalma.com ۲۰۲۲ مئی ۲۱، ۱:۰۰pm

۳۔انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۵۱۔

۴۔ناصر کاظمی، انتخاب میر (لاہور: مکتبہ خیال، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۰۰۔

۵۔رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو مع تعلیقات (لاہور: جوہر رحمانیہ پرنٹر، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۱۶۔

۶۔بقول ابن انشا، www.wikipedia.com

۷۔ناصر کاظمی، انتخاب میر، ص ۱۴۹۔

۸۔ایضاً، ص ۱۴۵۔

۹۔میر تقی میر، کلیات میر مرتبہ کلب علی خان فائق (لاہور: مجلس ترقی ادب، س۔ن۔)، ص ۲۷۵۔

۱۰۔فرزانہ اعظم لطفی، "مرزا اسد اللہ خان غالب کے غم نامے اور دردنامے کا تحقیقی جائزہ"، 11:10am، http://www.urdu.links.com، ۹ جون ۲۰۲۲

۱۱۔تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ تک (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، س۔ن۔)، ص ۳۱۷۔

۱۲۔اسد اللہ خان غالب، دیوان غالب مرتبہ صفدر حسین (لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۰ء)، ص ۱۴۱۔

۱۳۔ایضاً، ص ۲۵۔

۱۴۔محمد بشیر احمد بٹ، شرح دیوان غالب (لاہور: اردو بازار، ۲۰۰۲ء)، ص ۱۶۲۔

۱۵۔ایضاً، ص ۲۲۳۔

۱۶۔علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۱۲ء)، ص ۲۷۵۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۱۰۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۷۲۷۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۵۴۔

۲۰۔ عبادت بریلوی، جدید شاعری (کراچی: اردو دنیا حسن منزل، ۱۹۶۱ء)، ص ۱۹۰۔

۲۱۔ قاضی عبدالغفار، کلیات فانی (دکن: عبدالحق اکیڈمی، ۱۹۴۶ء)، ص ۱۴۔

۲۲۔ شمس الحق، پیمانے غزل (کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۸ء)، ص ۲۸۴۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۸۳۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۸۴۔

۲۵۔ طاہر تونسوی، فیض کی تخلیقی شخصیت (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، س۔ن۔)، ص ۲۱۔

۲۶۔ فیض، http://www.rekhta.com، ۱۲ مئی ۲۰۲۲، ۱:۱۵

۲۷۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (دہلی: ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس، ۱۹۸۹ء)، ص ۶۹۶۔

۲۸۔ امتیاز علی، فیض صاحب شخصیت اور شاعری (لاہور: اردو بازار، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۴۰۔

۲۹۔ ناہید قاسمی، ناصر کاظمی شخصیت اور فن (لاہور: فضل حق اینڈ سنز، ۱۹۹۰ء)، ص ۱۳۳۔

۳۰۔ ناصر کاظمی، http://www.rekhta.com، ۲۰ جون ۲۰۲۲، ۱:۲۰۔

۳۱۔ ناصر کاظمی، برگ نے (لاہور: مکتبہ خیال، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۲۱۔

۳۲۔ ناصر کاظمی، دیوان (لاہور: مکتبہ خیال، ۱۹۹۷ء)، ص ۳۸۔

۳۳۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل (کراچی: توکل اکیڈمی کاشانہ خلیل، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۲۴۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۳۲۔

۳۵۔ جمال عبدالواحد، غیر متداول کلام غالب (نئی دہلی: غالب اکیڈمی، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۲۰۔

۳۶۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۲۴۳۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۹۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۳۲۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۰۲۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۲۱۲۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۲۱۴۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۲۱۶۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۲۲۸۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۹۸۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۲۹۰۔

۴۶۔ ایضاً، ص ۳۰۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۴۹۲۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۹۸۔

۴۹۔ نبی احمد، اردو غزل میں ہجرت کا تجربہ پی ایچ ڈی، وفاقی اردو یونی ورسٹی برائے فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی، اسلام آباد، س۔ن۔، ص ۱۲۷۔

۵۰۔ آل احمد سرور، "اردو ادب میں جذبہ آزادی"، مشمولہ شاعر (س۔ن۔)، ص ۲۰۔

۵۱۔ محمد جاوید گل، ناصر کاظمی اور میر تقی میر کی ذہنی اور فکری مماثلتیں ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۳۔

۵۲۔ حسن رضوی، ناصر کا ظمی شخصیت اور فن (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۰۷۔

۵۳۔ ناصر کا ظمی، برگ نے، ص ۴۵۔

۵۴۔ ایضاً، ص ۳۵۔

۵۵۔ ایضاً، ص ۲۹۔۳۰۔

۵۶۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۱۷۰۔

۵۷۔ ایضاً، ص ۲۰۰۔

۵۸۔ ایضاً، ص ۳۲۔۳۳۔

۵۹۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا (لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۱۷ء)، ص ۲۷۔

۶۰۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۸۰۔

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۷۳۔

۶۲۔ ایضاً، ص ۱۳۴۔

۶۳۔ ایضاً، ص ۱۸۴۔

۶۴۔ ایضاً، ص ۲۳۹۔

۶۵۔ ایضاً، ص ۷۰۔

۶۶۔ ابوالخیر کشفی، "ثنائے خواجہ اور اقبال عظیم"، مشمولہ روشنائی، کراچی (۳۰ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷)، ص ۱۴۹۔

۶۷۔ راقمہ کا تسکین اقبال سے ٹیلی فونک انٹرویو، ۱۴ جنوری ۲۰۲۲ء۔

۶۸۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۹۱۔

۶۹۔ ایضاً، ص ۳۱۱۔

۷۰۔ ایضاً، ص ۷۳۔

۷۱۔ ایضاً، ص ۱۹۴۔

۷۲۔ ایضاً، ص ۹۵۔

۷۳۔ ایضاً، ص ۱۹۵۔

۷۴۔ ایضاً، ص ۱۸۲۔

۷۵۔ ایضاً، ص ۳۰۴۔

۷۶۔ ایضاً، ص ۲۸۔

۷۷۔ ایضاً، ص ۱۰۶۔

۷۸۔ ایضاً، ص ۲۶۷۔

۷۹۔ ایضاً، ص ۲۷۹۔

۸۰۔ نظیر صدیقی، "اقبال عظیم"، روشنائی، کراچی (۳۰ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷) ص ۱۵۸۔

۸۱۔ شاہین اقبال، "میرے والد محترم کی زندگی کے چند پہلو"، روشنائی، کراچی (۳۰ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷)، ص ۱۹۵۔

۸۲۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۴۰۷۔

۸۳۔ فرحت پروین ملک، "ایک دن ہم بھی بہت یاد کیے جائیں گے" مشمولہ روشنائی، شمارہ ۲۵، کراچی (اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۵ء)، ص ۴۵۔

۸۴۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۳۶۔۳۷۔

۸۵۔ ایضاً، ص ۱۷۹۔

۸۶۔ ایضاً، ص ۸۷۔

۸۷۔ ناصر حیات، اقبال عظیم حیات و ادبی خدمات (کراچی: توکل اکیڈمی کاشانہ خلیل، ۲۰۱۸ء)، ص ۱۳۶۔

۸۸۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۳۲۸۔

۸۹۔ ایضاً، ص ۱۹۶۔

۹۰۔ ایضاً، ص ۹۳۔

۹۱۔ ایضاً، ص ۱۲۸۔

۹۲۔ ایضاً، ص ۱۳۵۔۱۳۶۔

۹۳۔ ایضاً، ص ۳۷۷۔

۹۴۔ ایضاً، ص ۳۱۸۔

۹۵۔ ایضاً، ص ۳۴۲۔

۹۶۔ ایضاً، ص ۴۲۲۔

۹۷۔ جون ایلیا، شاید (کراچی: ایلیا اکادمی، ۱۹۹۰ء)، ص ۲۴۔

۹۸۔ حبیب جالب،کلیات حبیب جالب(لاہور:ماورا پبلی کیشنز،۱۹۹۳ء)،ص۲۹۔

۹۹۔ فیض احمد فیض،دست صبا(علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۸۲ء)،ص۱۹۔

۱۰۰۔ اقبال عظیم،کلیات غزل ماحصل،ص۲۱۰۔

۱۰۱۔ ایضاً،ص۱۰۸۔

۱۰۲۔ ایضاً،ص۳۴۸۔

۱۰۳۔ ایضاً،ص۲۱۰۔

۱۰۴۔ ایضاً،ص۹۰۔

۱۰۵۔ ایضاً،ص۸۲۔

۱۰۶۔ ایضاً،ص۸۵۔

۱۰۷۔ ایضاً،ص۹۱۔

۱۰۸۔ ایضاً،ص۲۴۰۔

۱۰۹۔ ایضاً،ص۷۳۔

۱۱۰۔ ایضاً،ص۷۵۔

۱۱۱۔ ایضاً،ص۱۰۱۔

۱۱۲۔ ایضاً،ص۲۲۰۔

۱۱۳۔ ایضاً،ص۸۴۔

۱۱۴۔ ایضاً،ص۲۰۸۔

۱۱۵۔ ایضاً،ص۲۳۷۔

۱۱۶۔ ایضاً،ص۷۸۔

۱۱۷۔ ایضاً،ص۲۱۵۔

باب سوم:

اقبال عظیم کی غزلوں میں سیاسی و سماجی شعور

ادب زندگی کی اقدار کا عکاس ہے اور زندگی مختلف جہات کی حامل ہے۔ یہ متنوع جہات ادب پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔ ادب زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق تہذیب و ثقافت سے ہو، سماجی اقدار سے، معیشت و اقتصادیات سے یا سیاسی صورت حال سے۔ ادب، سیاست اور سماج ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اس لیے کہ ہر دور میں تخلیق ہونے والا ادب اس عہد کی سیاسی تاریخ اور سماجی حالات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کسی بھی قوم اور معاشرے میں تخلیق ہونے والا ادب انقلاباتِ زمانہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں دنیا کے ہر ادب میں رونما ہونے والے سیاسی واقعات اور سماجی صورتِ حال کی عکاسی ملتی ہے۔

شعرا و ادبا اپنے ارد گرد کے ماحول اور عصری صورت حال کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کے سیاسی حالات سے نہ صرف متاثر ہوتے ہیں، بلکہ اپنی تخلیقات میں ان کی تصویر کشی بھی کرتے ہیں۔ حصولِ اقتدار کی ہوس، خانہ جنگی، لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت گری، عوام کی حق تلفی اور حکمراں طبقے کی بے حسی وغیرہ جیسے کرب ناک مسائل پر کبھی برملا اور کبھی رمز و کنایہ کے پیرائے میں قلم اٹھاتے ہیں۔ معاشرے کے حساس ترین افراد ہونے کی وجہ سے وہ سیاسی رہنماؤں کے جھوٹ، فریب، عہد شکنی اور استحصال جیسے منفی رویوں پر تڑپ اٹھتے ہیں، یہاں تک کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ساری دنیا کا دکھ انہیں اپنا ذاتی دکھ معلوم ہونے لگتا ہے اور وہ اپنی تخلیقات میں نہ صرف ان دکھوں کا پرچار کرتے ہیں، بلکہ ان کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کرتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری اور تحریروں کے ذریعے اپنے قارئین میں سیاسی شعور اجاگر کرنے میں اپنا مؤثر کردار ہی ادا نہیں کرتے، بلکہ انہیں جملہ سیاسی مسائل سے نبرد آزما ہونے اور سماجی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھانے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر مزمل حسین:

> شاعر اور ادیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خود کو روحِ عصر سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ تاریخ عالم پر نگاہ ڈالیں تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ کسی بھی عہد میں شاعر اور ادیب نے معاصر سیاسی،

سماجی اور معاشی رویوں سے خود کو غافل نہیں رکھا بلکہ اس وقت زیادہ فعال ہوئے جب قوموں پر کڑا وقت آیا۔[1]

زمانہ قدیم سے تاحال ادبی تخلیقات میں سیاسی موضوعات کے بیان کا سلسلہ جاری ہے۔ یونانی ادبا مثلاً ہومر اور ملٹن وغیرہ ہوں یا عالمی سطح پر شیکسپیئر، سارتر، پابلو نیرودا، میکسم گورکی، رسل، ٹینی سن اور نجیب محفوظ، سبھی نے اپنی تحریروں اور تخلیقات میں معاصر سیاسی و سماجی صورت حال کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

برِ صغیر میں صوفیا کرام نے حکمرانوں کے ظلم و بربریت اور ناانصافیوں کے ستائے ہوئے عوام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس ضمن میں حضرت مجدد الف ثانی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جنہوں نے مغل فرماں روا جلال الدین اکبر کی اسلام دشمن پالیسیوں کی کھل کر مخالفت کی اور اسے دینِ توحید دوبارہ اصل صورت میں رائج کرنے کی تبلیغ کی۔ اس کے نتیجے میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنا پڑیں، مگر وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔

شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں نے اپنے عہد میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی انتشار کے خلاف عملی جدوجہد کی اور جابر حکمرانوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے سکھوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے سترہ سو اکتیس میں بالاکوٹ کے مقام پر اپنی جانوں تک کا نذرانہ پیش کر دیا تاکہ عوام پر سکون زندگی بسر کر سکیں۔

صوفیا نے مذہبی و لسانی امتیازات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بلند تر روحانی اقدار کا پیغام دیا اور ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی۔ حضرت بلھے شاہؒ، وارث شاہؒ، شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ، سچل سرمستؒ، مست توکلیؒ، خوش حال خان خٹکؒ اور رحمان باباؒ وغیرہ جیسے عظیم بزرگانِ دین نے حکامِ وقت کے عتاب سے بے خوف ہو کر کڑے وقت میں پسے ہوئے مظلوم طبقے کی وکالت کی اور اپنی آفاقی شاعری کے ذریعے ان میں اعتماد پیدا کیا۔

اردو کی دکنی شاعری میں مثنوی کی صنف عروج پر تھی۔ بہت سے سلاطینِ دکن چونکہ خود بھی شاعر تھے اور شاعری کی سرپرستی کرتے تھے، اس لیے ان کی مثنویوں میں اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات و واقعات کا بیان ملتا ہے۔ بہمنی، عادل شاہی اور کتب شاہی عہد میں بھی جنوبی ہند کے سیاسی و سماجی حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ بعد کے زمانے میں جعفر زٹلی، عبد الرحمان بیجاپوری اور ولی دکنی کے ہاں بھی عصری مسائل کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان کے عہد میں مغلیہ حکومت کا

شیرازہ بکھر چکا تھا اور اورنگزیب عالم گیر کے جانشین حصولِ اقتدار کے لیے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے۔

ان کے علاوہ معروف ایہام گو شعرا خان آرزوؔ، نجم الدین آبروؔ، شاکر ناجیؔ، مصطفیٰ خان یک رنگؔ، شرف الدین مضمونؔ، شاہ حاتمؔ اور مظہر جانِ جاناںؔ کے ہاں بھی کبھی ایہام کے پیرائے میں اور کبھی واضح انداز میں معاصر سیاسی و سماجی صورت حال کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان اہلِ سخن کو بخوبی یہ اندازہ تھا کہ وہ غلامی کا شکار ہیں۔ مظہر جان جاناںؔ کا یہ شعر ان کے عصری شعور کا ترجمان ہے:

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار[۲]

میرؔ و سوداؔ کے دور میں سیاسی انتشار عروج پر تھا۔ مرزا رفیع سوداؔ دربارِ شاہی سے وابستہ تھے۔ ان کا اتنے فرمانرواؤں کا قصیدہ لکھنا اس بات کا غماز ہے کہ کوئی بھی مغل حکمران زیادہ عرصے تک تخت نشیں نہیں رہ سکا۔ انہوں نے اپنی ہجویہ شاعری میں تاجروں، سرکاری ملازمین، شعرا، ملاؤں، کاتبوں اور دیگر پیشہ وروں کے غیر ذمہ دارانہ رویوں کی عمدگی سے نقاب کشائی کی ہے۔

میر تقی میرؔ کی ساری زندگی آلام و مصائب میں بسر ہوئی۔ انہوں نے کئی بار دلی کو اجڑتے دیکھا۔ اس نے ان کی شاعری کو وہ درد عطا کیا جس کی کسک آج بھی پڑھنے والوں کو محسوس ہوتی ہے۔ ان کا درج ذیل شعر دلی اور اہلِ دلی کے حالات کا غماز ہے:

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا[۳]

خواجہ میر دردؔ صوفی شاعر ہونے کے باوجود حوادثِ زمانہ اور دلی کی ابتر سیاسی صورتِ حال سے بے خبر نہیں تھے۔ انہیں اس بات کا بخوبی ادراک تھا کہ بے چینی کے اس دور میں جینا بے حد مشکل ہے۔ اسی لیے وہ پکار اٹھے:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے[۴]

دلی کے دگرگوں حالات سے تنگ آکر بہت سے شعرا نے دکن، لکھنؤ اور فیض آباد ہجرت کی۔ ان میں میر حسنؔ، غلام ہمدانی مصحفیؔ، انشاؔ، جراتؔ اور رنگینؔ وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ لکھنوی شاعری پر گو خارجیت کا رنگ غالب تھا، تاہم اس دور کے شعرا کے ہاں بھی عصری صورتِ حال کی عکاسی ملتی ہے۔

پہلے "عوامی شاعر" نظیر اکبر آبادیؔ کی منظومات اپنے عہد کی سچی تصویر پیش کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنے معاشرے میں جن مسائل کو محسوس کیا، انہیں بنا کسی تصنع کے جوں کا توں بیان کر دیا۔ سیاست کے ساتھ ساتھ انہوں نے عوام کے معاشی و اقتصادی مسائل کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ نیز ہندوستانی ثقافت اور مختلف تہواروں پر بھی نظمیں کہیں۔ ان کی اس نوع کی منظومات میں ہولی، مفلسی، روٹیاں، خوشامد، پیسہ اور فکر آٹے دال کا وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ نظم "خوشامد" میں انہوں نے ہمارے معاشرے کے اہم ترین المیے یعنی خوشامد کے فوائد و ثمرات اور خوشامدیوں کو اسی گُر کی بدولت نوازے جانے کا نقشہ انتہائی دل کش انداز میں بیان کیا ہے:

عیش کرتے ہیں وہی جن کا خوشامد کا مزاج
جو نہیں کرتے وہ رہتے ہیں ہمیشہ محتاج
ہاتھ آتا ہے خوشامد سے مکاں ملک اور تاج
کیا ہی تاثیر کی اس نسخے نے پائی ہے رواج
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
حق تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے[5]

شاہ عالم ثانی کے عہدِ حکومت میں دلی کا امن بحال ہوا تو بہت سے شعرا دلی چلے آئے اور اس اجڑے دیار کی رونقیں پھر سے لوٹنے لگیں۔ یہ دور بہادر شاہ ظفرؔ کی معزولی تک کے عرصے پر محیط ہے۔ شاہ نصیرؔ، میر نظام الدین ممنونؔ، ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ اس عہد کے نمائندہ شعرا ہیں۔ ان اہلِ سخن نے برِ صغیر پر انگریزوں کا تسلط، مغلیہ سلطنت کا زوال، ابتر سیاسی و سماجی صورت حال کا بیان، اقتصادی بحران، نا اہل انتظامیہ کی کارکردگی پر طنز وغیرہ جیسے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ خود بہادر شاہ ظفرؔ کی حکومت بھی قلعے تک محدود تھی اور وہ انگریزوں کے رحم و کرم پر تھے۔ ان کا درج ذیل شعر ان کی اسی کیفیت کا ترجمان ہے:

اسیرِ کنجِ قفس ہوں میں اے نوا سنجو
بلا سے میری، جو آیا بہار کا موسم[6]

غالبؔ اس عہد کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے خطوط میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز دورِ حکومت میں پیدا ہونے والی سیاسی صورت حال اور بدلتی ہوئی سماجی اقدار کی جو تصویر کشی کی ہے، اسے ایک دستاویز قرار دیا جاسکتا ہے۔ خطوطِ غالبؔ کی سیاسی اور تاریخی اہمیت بیان کرتے ہوئے محمد خرم لکھتے ہیں:

> خطوطِ غالبؔ ۱۸۵۷ء کی دستاویزی حقیقت ہیں اور اتنی بڑی حقیقت ہیں کہ اگر تاریخ کہیں کھو بھی جائے تو ان خطوط سے اس عہد کی سیاسی تاریخ کے بیشتر گوشوں کو از سرِ نو مرتب کیا جاسکتا ہے[7]

البتہ غالبؔ کی شاعری کا معاملہ کچھ مختلف ہے۔ وہ روشِ عام سے ہٹ کر چلنا پسند کرتے تھے۔ اس لیے شدید ابتر سیاسی و سماجی صورت حال میں بھی وہ سرسید اور ان کے رفقا کی مقصدیت پسند روایت کے مقلد نہیں ہوئے۔ اس بات کی تائید شمیم حنفی کے درج ذیل الفاظ سے بھی ہوتی ہے:

> غالب کی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ سن سینتالیس کے ماحول سے ملتے جلتے ماحول میں گزرا تھا اور اٹھارہ سو ستاون سے کچھ پہلے اور بعد کے وہ تمام برس جنہیں ہم غالبؔ کی زندگی کے اختتامیے سے تعبیر کرسکتے ہیں، ان برسوں میں غالب نے تخلیقی سطح پر بڑی حد تک خاموش زندگی گزاری، لیکن یہ تو کیا کہ اپنی شاعری کو جنس بازار نہیں بننے دیا اور شاعری کے ذریعے، براہ راست طریقے سے قومی تعمیر اور سماجی تبدیلی کی جدوجہد میں شریک نہیں ہوئے۔ لیکن غالبؔ کی شاعری، ان کی سرگرم تخلیقی زندگی کے کسی بھی دور میں اپنے زمانے کی واردات سے لاتعلق نہیں ہوئی۔[8]

غدر کے بعد برِ صغیر پر انگریزوں کا تسلط پوری طرح قائم ہو چکا تھا اور اس نو آبادیاتی دور میں ہندوستان کے عوام سیاسی، سماجی، تہذیبی، مذہبی اور لسانی اعتبار سے انگریزوں کی غلامی کا شکار ہو رہے تھے۔ ان کے ذہن مغربی ثقافت اور طرزِ معاشرت کے اسیر ہو چکے تھے۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مشرقی تہذیب و ثقافت، نظامِ تعلیم، یہاں تک کہ مشرقی شعر و ادب اور صدیوں سے رائج مشرقی روایات کو فرسودہ قرار دیا جانے لگا اور اس کے برعکس مغربی ثقافت،

زبان سادر سائنسی تعلیم وغیرہ کو عام کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔ شعر وادب میں بھی مغرب کی پیروی پر خاص توجہ دی گئی۔ چنانچہ شاعری کے مقابلے میں نثر کو پزیرائی ملی اور غزل کے مقابلے میں نظم کا رواج عام ہونے لگا۔

اس نازک دور میں سر سید احمد خان قوم کے لیے ایک مصلح بن کر ابھرے۔ انہوں نے وقت کی ضرورت کو بھانپتے ہوئے اصلاح کی غرض سے بامقصد نثر لکھی اور اپنے بہت سے رفقا مثلاً ڈپٹی نذیر احمد، ذکا اللہ، چراغ علی، محمد حسین آزاد، محسن الملک اور وقار الملک وغیرہ کو بھی اپنا ہم خیال بنایا اور ان سب نے اپنی تحریروں کے ذریعے مقصدی تحریک میں سر سید کا بھرپور ساتھ دیا۔ شعرا میں حالیؔ نے ان کی سوچ کو تقویت عطا کی۔ انہوں نے نہ صرف خود "مسدس حالیؔ" جیسی اصلاحی نظمیں لکھیں، بلکہ اپنے ہم عصر شعرا کو بھی بامقصد شاعری کرنے کی ترغیب دی۔

علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر برِ صغیر کے عوام میں جب مصلحتاً مغربی نظامِ تعلیم، اقدار وروایات اور طرزِ معاشرت کی پیروی کا رواج عام ہونے لگا اور وہ اپنے اصل سے دور ہونے لگے تو ایسے میں اکبر الہ آبادیؔ نے اپنی ظریفانہ شاعری کے ذریعے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور انہیں یہ باور کرانے کی سعی کی کہ وہ ایک تابناک ماضی اور عظیم الشان روایت کے امین ہیں۔ ان کا اپنا ادب اور ایک الگ تاریخ ہے۔ لہٰذا انہیں مغرب کی اندھا دھند تقلید سے باز رہنا چاہیے۔ ان کے درج ذیل اشعار میں طنزیہ پیرائے میں مسلمانوں کے مغربی تہذیب سے مرعوب ہونے کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

چھوڑ لٹریچر کو، اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر، اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے، کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کر کلرکی خوشی سے پھول جا

علامہ محمد اقبالؔ نہ صرف اکبر الہ آبادیؔ کے ہم عصر تھے، بلکہ ان کے شاعرانہ افکار سے بے حد متاثر بھی تھے۔ انہوں نے جب یہ مشاہدہ کیا کہ مسلمانانِ برِ صغیر نہ صرف تیزی سے مغربی اقدار کے پیروکار ہوتے چلے جا رہے ہیں، بلکہ انہیں اس میں کوئی عار بھی محسوس نہیں ہو رہی تو انہوں نے انہیں اپنی ولولہ انگیز شاعری کے ذریعے بیدار کرنا شروع کیا۔ انہوں نے مسلمانوں میں یہ احساس بھی اجاگر کیا کہ وہ زمین پر اللہ کا نائب ہونے کی بنا پر اشرف المخلوقات ہیں۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ اپنا مقام و مرتبہ پہچانیں اور اپنی خداداد صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے معاشرے کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار

ادا کرے۔ انہوں نے اپنے تین سالا سفر یورپ کے دوران مغربی تہذیب کا گہرا مشاہدہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ تہذیبِ حاضر کی چمک اور چکاچوند آنکھوں کو خیرا تو ضرور کرتی ہے، مگر حقیقت میں یہ محض جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے اور اس کی تعمیر کھوکھلی بنیادوں پر استوار کی گئی ہے۔ لہٰذا اس کی غلامی نہ کی جائے۔ علامہ اقبالؔ نے مسلمانوں کو غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالنے اور جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم کے جذبے سے سرشار ہو کر آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی اسی ولولہ انگیز فکر کے عکاس ہیں:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں، نہ شمشیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا، تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
نظر کو خیرہ کرتی ہے، چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے[۱۰]

"رئیس المتغزلین" حسرت موہانیؔ نے اپنی غزلوں میں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ سیاسی مضامین بھی بیان کیے ہیں۔ انہوں نے انتہائی بے باکانہ انداز میں انگریزوں کے ظلم و بربریت کے خلاف آواز اٹھائی اور اس جرمِ بے باک گوئی کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ گوپی چند نارنگ حسرت کی سیاسی شاعری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

> انہوں نے غزل کی مخصوص اشاریت کو برتتے ہوئے سیاسی جذبات و احساسات کو بیان کر کے غزل کی ایک اور خدمت بھی کی۔ غزل میں سیاسی اور احتجاجی نوعیت کی شاعری کر کے انہوں نے ایک نئے باب کا آغاز کیا، اس راہ سے کانٹے نکالے اور آئندہ آنے والے شاعروں کے لیے ایک شاہراہ کھول دی۔[۱۱]

درج ذیل اشعار حسرت کے سیاسی شعور کے ترجمان ہیں:

پردہء اصلاح میں کوششِ تخریب کا
خلقِ خدا پر عذاب دیکھیے کب تک رہے[۱۲]
اچھا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں

پھیلے گی یوں ہی شورشِ حبِ وطن تمام[۱۳]

جنگِ عظیم اول اور ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے بعد دنیا کا سیاسی منظر نامہ تیزی سے بدلنے لگا۔ انقلاب روس کے نتیجے میں اشتراکی نظریات عام ہونا شروع ہوئے تو روسی ادبا نے بھی اپنی تحریروں میں مارکس اور لینن کے ان نظریات کی تبلیغ کی اور معاشرے کے کمزور طبقوں کے معاشی و معاشرتی استحصال کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس آواز کی گونج برِ صغیر میں بھی سنائی دی۔ چنانچہ وہاں کے ادیب بھی ان نظریات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور وہاں "ترقی پسند" اور "حلقہ ارباب ذوق" جیسی تحریکات کا آغاز ہوا۔ ان تحریکات سے وابستہ ادبا نے "ادب برائے زندگی" کا نعرہ بلند کیا اور اپنے ناولوں، افسانوں، مضامین، نظموں اور غزلوں میں معاشرے کے پسے ہوئے طبقوں کے سیاسی، سماجی، اور معاشی مسائل کی ترجمانی کی اور ان کے حقوق کے لیے صدائے احتجاج بلند کی۔ ان ادبا میں سجاد ظہیر، پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ شعرا میں علی سردار جعفریؔ، اسرار الحق مجازؔ، ساحر لدھیانویؔ، جاں نثار اخترؔ اور فیض احمد فیضؔ وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

جنگِ عظیم دوم کے بعد برطانیہ کی معیشت خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ اس لیے اب انگریزوں کے لیے ہندوستان کی آزادی ناگزیر تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اقتدار کی منتقلی کے حوالے سے کانگرس اور مسلم لیگ کے موقف میں شدید اختلاف تھا۔ ہندوؤں کے نزدیک ملک کو دو ٹکڑوں میں منقسم کرنا گاؤ ماتا کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دینے کے مترادف تھا۔ یوں بھی اکثریت میں ہونے کی وجہ سے ان کی یہ شدید خواہش تھی کہ انگریز اقتدار انہیں سونپ دیں اور وہ اپنی مرضی سے ہندوستان کا انتظام و انصرام چلائیں۔ جبکہ دوسری جانب مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ دو ایسی اقوام، جن کا مذہب، زبان، طرزِ فکر، نظریات و افکار، سیاست و معیشت اور تہذیب و معاشرت ایک دوسرے سے جدا ہوں، کبھی ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتیں۔ دوسرا انہیں یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر انگریزوں نے مغربی طرزِ جمہوریت اختیار کرتے ہوئے اقتدار اکثریت میں ہونے کی بنا پر ہندوؤں کو سونپ دیا تو وہ انگریزوں کی عارضی غلامی سے نجات پا کر ہندوؤں کی دائمی غلامی کا شکار ہو جائیں گے۔ یوں ان کا تشخص اور بقا خطرے میں پڑ جائے گی۔

۱۹۴۵ء/۱۹۴۶ء کے انتخابات کے نتائج سے بھی صاف ظاہر تھا کہ کانگرس ہندوؤں جبکہ مسلم لیگ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی واحد جماعت ہے۔ برطانوی حکومت نے پہلے ایک وفد اور پھر وزارتی مشن ہندوستان بھیجا تاکہ یہاں کے

سیاسی مسائل کا کوئی مناسب حل نکالا جاسکے۔ مگر یہ مشن بری طرح ناکام رہا۔ اس لیے کہ اس کی تمام تر کانگرس نواز تجاویز کو مسلم لیگ نے رد کر دیا۔

دونوں جماعتوں میں کسی بات پر سمجھوتہ نہ ہو سکا اور اختلافات طول پکڑتے گئے۔ یہاں تک کہ ہندوستان بھر میں فسادات برپا ہونے لگے۔ آخر برطانیہ نے پاکستان اور ہندوستان سے متعلق تین جون کا منصوبہ شائع کیا جس کے مطابق ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو دو الگ اور خود مختار ریاستیں قائم کر دی گئیں۔ یوں مشرقی ہند میں مشرقی اور مغربی ہند میں مغربی پاکستان کی بنیاد پڑی۔

اس تقسیم کے نتیجے میں عوام کی ایک بہت بڑی تعداد نے پاکستان سے ہندوستان اور ہندوستان سے مشرقی و مغربی پاکستان ہجرت کی۔ دورانِ ہجرت انہیں بے پناہ آلام و مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ لاکھوں افراد بے گھر ہوئے اور ہزاروں نے جان کا نذرانہ پیش کیا۔ بہت سی خواتین کی عصمتیں لٹیں، سہاگ اجڑے اور گودیں ویران ہوئیں۔ کئی افراد رستے کی مشکلات یا مہاجرین کیمپوں میں بھوک، پیاس اور بیماریوں سے لڑتے لڑتے دم توڑ گئے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا اور ساری فضا پر خوف و ہراس کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ اپنی کتاب میں اس صورت حال کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ۱۹۴۷ء کے آخر تک ساٹھ لاکھ مہاجرین پاکستان ہجرت کر کے آئے تھے۔ جامِ شہادت نوش کرنے والے مسلمانوں کی تعداد پانچ لاکھ تھی۔ نوزائیدہ ملک پاکستان کے گلی کوچے مہاجرین کی آہ و بکا اور چیخ پکار سے بھرے پڑے تھے۔ سرحدی شہیدوں پر گدھ منڈلاتے تھے۔ در و دیوار پر خون کے چھینٹے تھے۔ لاشیں گلیوں میں بکھری پڑی تھیں [۱۴]

اس انسانیت سوز سانحے پر ہر دل غمگین اور ہر آنکھ اشک بار تھی۔ قیامِ پاکستان کے دوران پیش آنے والے حادثات لوگوں میں بہت سی ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کا باعث بنے۔

عوام کے ساتھ ساتھ بہت سے شعرا و ادبا کو بھی ہجرت کے ہولناک تجربے سے گزرنا پڑا۔ معاشرے کے حساس ترین افراد ہونے کی بنا پر ان کا مشاہدہ عام لوگوں سے مختلف اور گہرا ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ہجرت کے جو دل خراش

مناظر دیکھے اور انسانیت کا جو درد محسوس کیا، اس کا تخلیقی اظہار کیا۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور شاعری میں قیامِ پاکستان اور اس کے بعد کی سیاسی و سماجی صورتِ حال کی تصویر کشی اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔

بہت سے مہاجر و غیر مہاجر شعرا نے نباضِ قوم کی حیثیت سے اپنی غزلوں میں اپنے عہد کے سیاسی مسائل، رہنماؤں کی بے حسی، مفاد پرستی، ملک دشمن پالیسیوں اور جبر و استحصال کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور عوام میں سیاسی شعور اجاگر کیا۔ ان شعرا میں ناصرؔ کاظمی، منیرؔ نیازی، حبیبؔ جالب، احمد ندیم قاسمیؔ، فیض احمدؔ فیض اور اقبالؔ عظیم وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر اقبالؔ عظیم گو پیشے کے اعتبار سے معلم اور ماہرِ تعلیم تھے، مگر اپنے عہد کی سیاسی و سماجی صورت حال پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے قیامِ پاکستان کے دوران برپا ہونے والے خوں ریز فسادات کے مناظر بھی دیکھے اور بلکتی ہوئی انسانیت کی چیخ و پکار بھی سنی۔ خود دہری ہجرت کی اذیت اور غریب الوطنی کا کرب سہا۔ اپنے ہی وطن میں اجنبی اور مہاجر کہلائے۔ اپنے ہم وطنوں کی تعصب آمیز باتوں اور نفرت بھری نظروں کا سامنا کیا۔ معذوریٔ چشم کے بعد رفقا کار کے بدلے ہوئے رویے برداشت کیے۔ سیاسی رہنماؤں اور عسکری قیادت کی ملک دشمن پالیسیوں کی بنا پر پاکستان کو دولخت ہوتے دیکھا۔ یہاں تک کہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھی عبرت حاصل کرنے کی بجائے سیاسی رہنماؤں کو قومی ترقی اور ملکی سالمیت کو داؤ پر لگاتے دیکھا۔ اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے ملک میں قوم کو صوبائی، نسلی اور لسانی تعصبات اور مسالک کے اختلافات کی بنا پر لڑتے اور ایک دوسرے کا قتل کرتے دیکھا۔ ان سب تجربات و مشاہدات نے اقبالؔ عظیم کو فہم و فراست اور وہ سیاسی بصیرت عطا کی جس سے ان کی غزلوں میں مقصدیت اور جدوجہد کا عنصر پیدا ہو گیا۔ اقبالؔ عظیم نے زندگی میں پیش آنے والے تلخ تجربات کی روشنی میں شاعری کے ذریعے اپنے ہم وطنوں کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا تاکہ انہیں ان تکالیف اور آلام و مصائب سے نہ گزرنا پڑے جن کا سامنا خود انہیں کرنا پڑا۔ وہ کہتے ہیں:

زمانہ دیکھا ہے ہم نے، ہماری قدر کرو
ہم اپنی آنکھوں میں دنیا بسائے بیٹھے ہیں[۱۵]

اقبالؔ عظیم ایک غزل گو شاعر ہیں۔ غزل کو عموماً عشق و محبت کے لطیف جذبات کے اظہار کا ذریعہ خیال کیا جاتا ہے۔ مگر اقبالؔ عظیم کے ہاں روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ عصری مسائل کی ترجمانی بھی ملتی ہے۔ انہوں نے غزل ہی کے

پیرائے میں اپنے ہم وطنوں کو درست سمت کی جانب گامزن کرنے کی سعی کی ہے۔ اس ضمن میں نذیر صدیقی رقم طراز ہیں: "اقبال عظیم کی شاعری غزلوں سے عبارت ہونے کے باوجود مقصدی شاعری کا فریضہ ادا کر رہی ہے۔"[۱۶] اقبال عظیم کی آخری دور میں لکھی گئی غزلوں پر مقصدیت اور تسلسل کی بنا پر نظم کا گمان ہوتا ہے۔ ان کے دورِ ثانی کی بہت سی غزلیات پڑھ کر بے ساختہ علامہ اقبال کے اشعار ذہن میں آجاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی ان غزلوں پر اقبال کے افکار کی گہری چھاپ موجود ہے۔ ان کی غزلیں قومی و ملی جذبے سے سرشار ہیں۔ اقبال کی طرح حرمتِ انسانی، عظمتِ اسلاف، حب الوطنی، حریت و مساوات، اخوت و اتحاد، خودداری، عشقِ رسول ﷺ، قرآن و سنت کی پیروی، حق گوئی و بے باکی، ظلم کی مخالفت، جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم جیسے موضوعات اقبال عظیم کی غزلوں میں بھی تواتر سے ملتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال عظیم علامہ اقبال کے شاعرانہ افکار سے بے حد متاثر تھے۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> انیس کی بہت عزت کرتا ہوں۔ اکبر الہ آبادی کو ان کے فن میں درِ یتیم جانتا ہوں۔ جوش، حفیظ، فراق اور مجاز کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ یگانہ چنگیزی کو ان کے مزاج کے باوجود پسند کرنے پر مجبور ہوں اور اقبال کو اردو شاعری کی معراج سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ سے کہا جائے کہ ان میں سے صرف ایک کا انتخاب کر لوں تو بلا تامل اقبال کا دامن تھام لوں گا۔ اس لیے کہ اقبال نے جو کچھ ہمیں دیا ہے، ہمارے پورے سرمایہ شاعری پر بھاری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال ہمارے تمام سخنوروں کے سرتاج ہیں اور ان کی شاعری مجموعی حیثیت سے ہماری شاعری کا حرفِ آخر۔[۱۷]

اقبال عظیم ایک حساس اور باشعور شاعر تھے۔ انہیں اللہ رب العزت نے کمال سیاسی بصیرت سے نوازا تھا۔ ان کی بہت سی غزلیں ان کے سیاسی و سماجی شعور کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی غزلوں میں مسلسل ارتقا نظر آتا ہے۔ تقسیم سے پہلے کی شاعری عشق و محبت کے روایتی مضامین کی حامل تھی۔ مگر مشرقی پاکستان ہجرت کے بعد ان کی شاعری میں رفتہ رفتہ تبدیلی واقع ہونا شروع ہوئی اور وہ غمِ جاناں سے غمِ دوراں کی طرف مڑ گئی۔ غمِ دوراں کے معاملے میں انہوں نے اپنے ذاتی غم کی بجائے اجتماعی المیے کی ترجمانی کی ہے۔ اس المیے سے مراد پاکستان کا المیہ ہے۔ یہ موضوع ان کے دل و دماغ پر اس قدر حاوی ہوا کہ باقی تمام موضوعات پس پشت جا پڑے۔ ان کے دورِ ثانی کی غزلوں کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ذاتی غم معاشرے کے اجتماعی غم میں کہیں جذب ہو کر رہ گیا ہے۔ بقول نذیر صدیقی: "ان کی شاعری میں یہ غم چار

چیزوں سے عبارت ہے۔ وطن، اہلِ وطن، غیر مخلص قائدین اور بد نصیب مہاجرین۔[18] برِ صغیر کے لاکھوں مسلمانوں کی طرح اقبال عظیم کو بھی ہجرت کی اذیت سے گزرنا پڑا۔ اپنا گھر بار، وطن اور اہلِ وطن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہونا کسی بھی شخص کے لیے آسان نہیں ہوتا۔ اقبال عظیم کے لیے بھی یہ فیصلہ یقیناً بہت دشوار تھا۔ شاید اسی لیے انہوں نے قیام پاکستان کے تین سال بعد مشرقی پاکستان ہجرت کی۔ انہیں بھی پاکستان بننے کی بے پناہ خوشی تھی۔ یہ تصور ان کے لیے بھی انتہائی خوش آئین تھا کہ لاکھوں مسلمانانِ برِ صغیر کی قربانیاں رنگ لائیں گی۔ اب وہ اور ان کے سب ہم وطن آزاد وطن کی آزاد فضاؤں میں سانس لیں گے، اسلام کے زریں اصولوں کے مطابق خوش حال زندگی گزاریں گے، اور مل کر مملکت خداداد کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کریں گے۔ مگر ان کی یہ امیدیں پوری نہ ہوئیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے سارے خواب چکنا چور ہوتے چلے گئے۔ انہیں وہ خوش گوار فضا اور ساز گار ماحول میسر نہ آسکا جس کی آرزو لے کر وہ مشرقی پاکستان آئے تھے۔ انہیں ملک میں ہر سُو بے چینی اور بے اطمینانی محسوس ہوئی۔ وہ پیارے وطن میں بے روزگاری، افلاس و احتیاج، بھوک، اقتصادی بدحالی، رشوت، سفارش، سمگلنگ، لوٹ کھسوٹ، صوبائی و لسانی تعصبات، فرقہ واریت، عصمت و عفت کے تقدس کی پامالی، جبر و استحصال، مارشل لاء کی سختیاں، مرکز اور صوبوں کی محاذ آرائی، سیاسی رہنماؤں کی اقتدار کے لیے جنگ اور جمہوریت کی بگڑتی ہوئی صورت حال دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی اسی تڑپ کے آئینہ دار ہیں:

سحر نہیں ہے یہ شاید، نظر کا دھوکہ ہے
چراغ گُل نہ کرو، تیرگی کا ٹھیک نہیں[19]

منزل تو خوش نصیبوں میں تقسیم ہو چکی
کچھ خوش خیال لوگ ابھی تک سفر میں ہیں[20]

بات پہلے جہاں تھی وہیں ہے ابھی، اور اب بھی کہا جا رہا ہے یہی
صبح ہو جائے گی، دن نکل آئے گا، اور یہ پہرے اندھیروں کے ٹل جائیں گے[21]

ے بے نور اجالوں کو سحر کیسے سمجھ لوں
تم لاکھ کہے جاؤ کہ اب رات نہیں ہے[۲۲]

اقبال عظیم کو شروع ہی سے اس بات کا اندازہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں انہیں وہ مقام حاصل نہیں، جو کسی ملک کے باشندے کو ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ قیام پاکستان کے وقت ہی سے وہاں عصبیت کا بیج بو دیا گیا تھا۔ جس کی روح سے بنگالیوں اور غیر بنگالیوں میں فرق روا رکھا گیا تھا۔ غیر بنگالیوں کو ہمیشہ مہاجر ہی سمجھا گیا۔ اقبال عظیم کو بھی اسی تعصب کا نشانہ بننا پڑا۔ ان کے لیے یہ بات بے حد تکلیف دہ تھی کہ وہ اور ان کے دیگر رفقا دلوں میں امن و خوش حالی کی آرزو لیے آگ و خون کا دریا عبور کر کے جس وطن میں وارد ہوئے تھے، وہاں انہیں اس ملک کا شہری ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا یا پھر دوسرے درجے کا شہری سمجھا گیا۔ اس تکلیف کی شدت ان کے درج ذیل اشعار میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے:

ے جہاں بھی ہم نے صدا دی، یہی جواب ملا
یہ کون لوگ ہیں، پوچھو کہاں سے آئے ہیں[۲۳]

ے گھر سے چل کر ہم کہاں تک آ گئے
اجنبی ماحول، نا معلوم لوگ[۲۴]

ے ترا مزاج مگر اب بھی ہم سے برہم ہے
نہ جانے کون سی کی ایسی دشمنی ہم نے[۲۵]

ے یہ کس کے شہر میں بھولے سے آ گئے ہم لوگ
نہ گفتگو کی اجازت، نہ مسکرانے کی[۲۶]

نئے وطن میں اجنبیت اور بیگانگی کے احساس نے اقبال عظیم کو ہمیشہ تکلیف میں مبتلا کیے رکھا۔ مشرقی پاکستان کے عوام کے ذہنوں اور دلوں میں صوبائی عصبیت اور دیگر کئی وجوہات کی بنا پر غیر بنگالیوں کے لیے نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا

واضح اظہار ان کے جارحانہ خیالات، شکایت آمیز گفتگو اور قہر آلود نظروں سے ہوتا تھا۔ اقبال عظیم جیسے حساس اور باشعور شاعر کے لیے اس ساری صورت حال کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ لہٰذا انہیں بہت جلد یہ ادراک ہو گیا کہ غیر بنگالی ہونے کی بنا پر انہیں کبھی یہاں شناخت نہیں مل سکتی۔ ان کی غزلوں کے متعدد اشعار عدم شناخت کے اسی دکھ کے ترجمان ہیں۔ مثلاً

؎ شریکِ محفل ہیں یوں تو ہم بھی، مگر بہ اندازِ خود فریبی
مزاجِ محفل بھی اجنبی سا، نگاہِ ساقی بھی اجنبی سی
عجیب منزل پہ آ کے ٹھہرے ہیں راہِ امروز کے مسافر
نگاہِ ماضی میں برہمی سی، جبینِ فردا پہ تیرگی سی[۲۷]

اقبال عظیم کو بہت جلد یہ محسوس ہو گیا کہ وہ اس وطن میں جس روشن سحر کے منتظر ہیں، وہ طلوع ہوتی نظر نہیں آتی۔ یہاں اول تو چراغاں کی کوئی صورت ہی نہیں، اور اگر روشنی کا اہتمام ہوتا بھی ہے تو ان چراغوں کے ذریعے جن کی روشنی کسی بھی وقت ماند پڑ سکتی ہے اور جو کبھی بھی بجھ کر روشنی کو تاریکی میں بدل سکتے ہیں۔ چراغ کا استعارہ اقبال عظیم کی شاعری میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے اور مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ سیاسی تناظر میں چراغ سے مراد امن اور خوش حالی لی جا سکتی ہے جس کی بنا پر کسی ملک اور اس کے باسیوں کو پر سکون زندگی میسر ہوتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں خوش حالی کا دور آتا ضرور تھا۔ مگر قلیل مدت کے لیے۔ اس لیے کہ ہندو اور مغربی طاقتیں چاہتی ہی نہیں تھیں کہ اس خطے کے عوام نسلی و لسانی تعصبات سے بالاتر ہو کر پر امن اور خوش حال زندگی بسر کریں۔ اقبال عظیم کو ملک میں عارضی امن و سکون گوارا نہیں تھا۔ وہ دائمی خوش حالی کے خواہاں تھے۔ ان کی یہ خواہش شدت سے ان کی غزلوں کے متعدد اشعار میں جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً:

؎ جو ممکن ہو تو سچ مچ کے اجالے ڈھونڈ کر لاؤ
چراغِ مضمحل کی ضو سے غم خانہ نہ بدلے گا[۲۸]

؎ اس جشنِ چراغاں سے تو بہتر تھے اندھیرے

ان جھوٹے چراغوں کو بجھا کیوں نہیں دیتے[۲۹]

اقبال عظیم کو ہجرت کے فوراً بعد ہی مشرقی پاکستان کی فضا میں بے چینی اور بے اطمینانی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ ایک بے یقینی کی سی کیفیت میں مبتلا تھے۔ انہیں ہمہ وقت کوئی انجانا خوف گھیرے رہتا تھا۔ ابھی تو پہلی ہی ہجرت کے زخم نہیں بھرے تھے۔ اقبال عظیم کے اشعار پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں یہ خدشہ لاحق تھا کہ وہ بمشکل جس نئے وطن میں آباد ہوئے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں اس سے بھی دربدر ہونا پڑے اور کہیں پھر سے خانہ بدوشی ان کا مقدر نہ بن جائے۔ اہلِ مشرقی پاکستان کی قومیت پرستی اور سرد رویے انہیں ہمیشہ بے قرار رکھتے تھے۔ وہ بظاہر اپنے ہم وطنوں کے شانہ بشانہ چل رہے تھے اور اپنے جملہ فرائض انجام دے رہے تھے، مگر بجھے ہوئے دل کے ساتھ۔ ان کے قدم تو ملکی ترقی کے لیے بڑھ رہے تھے مگر ڈگمگا ڈگمگا کر۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی انہیں کیفیات کے غماز ہیں:

؎ زہر دے دے نہ کوئی گھول کے پیمانے میں
اب تو جی ڈرتا ہے خود اپنے ہی مے خانے میں[۳۰]

؎ چمن میں دیکھیے اب کے ہوا کدھر کی چلے
خزاں نصیبوں نے پھر آشیاں بنائے ہیں[۳۱]

؎ شکست کھائی ہے زندگی نے، خود اپنے عزمِ غلط کے ہاتھوں
قدم بظاہر تو بڑھ رہے ہیں، مگر بباطن ہے بے دلی سی[۳۲]

؎ انجامِ بہاراں کے ڈر سے، پھولوں کو پسینے آتے ہیں
وہ خونِ جگر ہے گلشن کا، جو گریۂ شبنم ہوتا ہے[۳۳]

آنے والے کچھ سالوں میں یہ ثابت ہو گیا کہ اقبال عظیم کے یہ خدشات بے بنیاد اور خام خیالی پر مبنی نہیں تھے۔ انہیں سچ مچ ۱۹۷۰ء میں سقوطِ ڈھاکہ سے محض ایک سال قبل ملک کی کشیدہ صورتِ حال کے پیشِ نظر مشرقی پاکستان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنا پڑا اور اپنی خواہش کے بر خلاف دوسری مرتبہ ہجرت کی اذیت سے دوچار ہونا پڑا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مشرقی پاکستان کے عوام کی رضامندی سے مسلم اکثریتی علاقوں میں الگ اور خود مختار ریاست قائم کی گئی تھی تو پھر ایسا کیا ہوا کہ نوبت قتل و غارت گری اور فسادات تک آن پہنچی اور بالآخر ملک ہی دولخت ہو گیا؟ اس سوال کے جواب کی تلاش کے لیے بعض تاریخی حقائق اور ان عوامل سے آگاہی بے حد ضروری ہے جو اس علیحدگی کا محرک بنے۔

تحریکِ پاکستان کی جدوجہد میں مغربی پاکستان کے عوام کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانانِ برِ صغیر کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ کا قیام بھی ڈھاکہ میں عمل میں آیا تھا اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منظور ہونے والی قرارداد لاہور پیش کرنے والے اے۔کے۔ فضل الحق کا تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا۔ تہذیب و ثقافت، رنگ و نسل، زبان، لباس اور خوراک ہر اعتبار سے مشرقی پاکستان کے لوگ مغربی پاکستان کے عوام سے مختلف تھے۔ علاوہ ازیں رقص و موسیقی اور شاعری سے لگاؤ بھی انہیں بنگالی ہندوؤں سے قریب کرتا تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود وہاں کے عوام نے قیام پاکستان کے لیے اپنا فعال کردار ادا کیا۔ محض مذہب اسلام وہ قوت تھی جو دونوں خطوں کو باہم مربوط کیے ہوئے تھی اور اسی کی بنیاد پر دونوں علاقوں سے تعلق رکھنے والے عوام نے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا۔

افسوس کہ مشرقی پاکستان کے عوام اپنی تمام تر وفاداریوں کے باوجود اندرونی و بیرونی سازشوں کا شکار ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں ان میں عدم قومیت اور احساسِ کمتری پیدا ہوتا چلا گیا۔ کمال متین الدین اس حوالے سے لکھتے ہیں: "کسی بھی طرح عوامی عدم مماثلت نے بنگالیوں کی پاکستان سے وفاداری کو نہ بدلا ہوتا اگر انہیں کم تر سمجھا جاتا یا انہیں ان کے جائز حقوق سے محروم نہ رکھا جاتا۔"[۳۴] حقیقت یہ ہے کہ بھارت اور مغربی طاقتیں قیام پاکستان سے قبل بھی یہ نہیں چاہتی تھیں کہ مسلمان کسی آزاد اور خود مختار ریاست میں پر امن زندگی گزاریں۔ تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس خطے کا امن برقرار رہنے دیتیں۔ چنانچہ بھارت کی یہ بھرپور کوشش تھی کہ پاکستان کو اس نہج پر پہنچا دیا جائے کہ وہ بھارت میں ضم

ہونے پر مجبور ہو جائے۔ اپنی اس مذموم سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دشمن نے سازشوں کا جال بچھا دیا۔ سب سے پہلے بھارت نے انگریزوں سے مل کر معاشی و جغرافیائی تقسیم کے حوالے سے پاکستان کو نقصان پہنچایا۔ مشرقی و مغربی پاکستان کے مابین تقریباً ایک ہزار میل کا فاصلہ تھا اور دونوں خطوں میں کوئی زمینی رابطہ نہیں تھا۔ مشرقی پاکستان میں صنعت و تجارت اور تعلیم کا شعبہ ہندوؤں کے زیرِ انتظام تھا۔ ہندو اساتذہ نے بنگالی طلبہ میں علاقائی تحفظ کی آڑ میں قومیت کا جذبہ ابھارنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ مجیب الرحمن انہی طلبہ میں سے ایک تھا جس نے پاکستان کی علیحدگی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بقول عنایت اللہ:

> بھارت اور علیحدگی پسند عناصر نے یونیورسٹی کو خاص طور پر پروپیگنڈے کا نشانہ بنایا۔ یہی وجہ تھی کہ طلبہ میں علیحدگی کی تحریک زیادہ شدید تھی۔ مجیب انہیں کا لیڈر تھا اور وہ طلبہ کے کچے ذہنوں میں مغربی پاکستان کے خلاف خوب زہر بھر رہا تھا۔[۳۵]

انہی ہندو اساتذہ نے بنگالیوں میں یہ احساس بھی اجاگر کیا کہ انہیں اپنے جداگانہ تشخص اور بقا کے لیے اردو کی بجائے بنگالی زبان کو فروغ دینا چاہیے۔ لہٰذا ان کی اس سازش کے نتیجے میں اردو بنگالی تنازع شدت اختیار کر گیا اور جا بجا فسادات برپا ہونے لگے۔ گو بنگالیوں کے شدید احتجاج کے نتیجے میں ۱۹۵۶ء کے آئین میں اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی کو بھی ملک کی قومی زبان قرار دے دیا گیا۔ مگر تب تک صورت حال بے قابو ہو چکی تھی اور دوری اور نفرت کا یہ بیج تیزی سے پروان چڑھتا جا رہا تھا۔

ہندوؤں کے ساتھ ساتھ دونوں خطوں کی عوام میں فاصلے اور کدورتیں بڑھانے میں بہت بڑا عمل دخل اس وقت کی سیاسی و عسکری قیادت کی ملک دشمن پالیسیوں کا بھی تھا۔ انہیں عوامی مسائل سے دلچسپی نہ تھی بلکہ اپنے ذاتی مفادات عزیز تھے اور صرف اقتدار کا حصول ان کی ترجیحات میں شامل تھا۔

۱۹۵۳ء میں آنے والے قحط میں بھی مسلم لیگ مشرقی پاکستان کے عوام کی امیدوں پر پورا نہ اتر سکی۔ اس سے ان میں احساسِ محرومی مزید بڑھ گیا۔ علاوہ ازیں ۱۹۵۳ء میں جنرل غلام محمد کے ہاتھوں خواجہ ناظم الدین کی برطرفی، ۱۹۵۶ء کے آئین میں ون یونٹ کے قیام اور ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء نے بھی بنگالیوں میں شدید غم و غصہ پیدا کر دیا۔

جنرل ایوب خان برسر اقتدار آئے تو انہوں نے دونوں خطوں کے عوام میں فاصلے کم کرنے کے لیے کچھ اقدامات ضرور کیے۔ مگر ان سے بھی کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہو سکا۔ دوسری جانب مشرقی و مغربی پاکستان کو متحد رکھنے والے سہروردی کا انتقال ہو گیا اور عوامی لیگ کی قیادت شیخ مجیب الرحمن نے سنبھال لی۔ انہوں نے بنگالیوں میں جذبہ قومیت ابھارنے میں کلیدی کردار ادا کیا اور بہت جلد بنگالی عوام میں مقبولیت حاصل کر لی۔

۱۹۷۰ء میں آنے والا سیلاب اور بہت سی اشیاء کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان کے عوام کے دلوں سے مغربی پاکستان اور وہاں کے لوگوں کی محبت بھی بہالے گیا۔ کیوں کہ اس تکلیف دہ موقع پر بھی مسلم لیگ سیلاب زدگان کی توقعات پر پوری نہیں اتر سکی تھی۔ حکام وقت نے اس خطے کو غربت کی لکیر تک پہنچا دیا تھا۔ آئے دن کی ہڑتالوں اور ہنگامہ آرائی نے ملکی معیشت کو بری طرح تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ دشمن نے مشرقی پاکستان کے عوام میں یہ تاثر عام کر دیا کہ مغربی پاکستان معیشت کا زیادہ حصہ خود ہڑپ کر جاتا ہے جبکہ پیداوار کا اصل ذریعہ مشرقی پاکستان ہے۔ اس منفی سوچ نے بنگالیوں میں احساسِ محرومی کو مزید بڑھا دیا۔ قدرت اللہ شہاب اس تاثر کی نفی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مال وزر کی اس تکثیر و تقسیم میں مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں برابر کے شریک تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بنگالی حضرات اپنا لائسنس زیادہ تر مغربی پاکستان میں فروخت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کیونکہ یہاں پر خریدار نسبتاً زیادہ تھے اور قیمت بھی زیادہ ملتی تھی۔ بظاہر اس سے یہی گمان ہوتا تھا کہ اس بندر بانٹ میں مغربی پاکستان کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جا رہا ہے، لیکن حقیقت میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔[۳۶]

مشرقی پاکستان کی سیاسی صورت حال بری طرح بے قابو ہونے لگی تھی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ جبکہ مغربی پاکستان میں مسلم لیگ نے اکثریت حاصل کی۔ دونوں جماعتوں کے سربراہان یعنی شیخ مجیب اور ذوالفقار علی بھٹو میں اقتدار سنبھالنے کے حوالے سے کسی بات پر اتفاق نہ ہو سکا۔ لہٰذا ملک کے طول وارض میں جلاؤ گھیراؤ اور اشتعال کا دور دوراں ہو گیا۔ شیخ مجیب الرحمن کے پیش کیے جانے والے چھے نکات بھی ملک کو دو الگ ریاستوں میں منقسم کرنے کا پیش خیمہ ثابت ہو رہے تھے۔ اس لیے جنرل یحییٰ خان نے انہیں ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ صدر جنرل یحییٰ خان شراب نوشی سمیت بے شمار اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھے اور کسی طور ملک کی سربراہی کے اہل نہ تھے۔ آخر انہی

کی نا اہلی ملک کو لے ڈوبی جب ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ناقص منصوبہ بندی اور فوج اور اسلحے کی کمی کی بنا پر پاکستان دو لخت ہو گیا۔ مشرقی پاکستان میں فوج کی کمانڈ جنرل امیر عبد اللہ خان نیازی سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کے اور ان کے ساتھیوں کے لیے اپنے ہی مسلمان ساتھی فوجیوں کے خلاف صف آرا ہونا بہت مشکل تھا۔ انہیں ذہنی اور نفسیاتی طور پر یہ بات گوارا نہ تھی۔ آخر ناقص حکمتِ عملی، حکمرانوں کی بے حسی اور دشمن کی جانب سے کی جانے والی مذموم اور جارحانہ کاروائیوں کی بنا پر ہمیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

مذکورہ معاشی و جغرافیائی، تہذیبی و ثقافتی، سماجی و نفسیاتی اور سازشی و سیاسی عوامل کی بنا پر وطنِ عزیز کی ساکھ اور سالمیت کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اس کا ازالہ ممکن ہی نہیں۔ یہ پاکستانی ہی نہیں، اسلامی تاریخ کا بھی ایک سیاہ باب ہے جسے تاریخ کے اوراق سے مٹایا نہیں جا سکتا۔

اقبال عظیم کو مشرقی پاکستان سے بے پناہ محبت تھی۔ اسی سرزمین میں انہوں نے اپنی زندگی کے بیس سال بحیثیتِ معلم اور اردو زبان و ادب کے ایک رضاکار کی حیثیت سے گزارے تھے۔ انہوں نے اس صوبے میں اردو زبان و ادب کے استحکام اور تبلیغ و اشاعت کے لیے بہت سی علمی و تحقیقی خدمات سرانجام دیں۔ انہوں نے ۱۹۵۴ء میں چٹاگانگ سے شائع ہونے والی تصنیف "مشرقی بنگال میں اردو" میں مشرقی پاکستان کی دو صدیوں پر محیط اردو زبان و ادب کی تاریخ کا تحقیقی جائزہ لینے کی کوشش کی۔ حکیم ناطق لکھنوی اس امید پر اپنا دیوان لے کر کلکتہ سے چٹاگانگ تشریف لائے تھے کہ نئی اسلامی ریاست میں ان کا دیوان شائع ہو گا اور ان کی شاعری کی قدر پہچانی جائے گی۔ مگر جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی یہ امید پوری نہ ہوئی۔ اقبال عظیم کو جب اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے مسودہ حاصل کر کے اسے مرتب کیا اور "دیوانِ ناطق" کے نام سے شائع کیا۔ انہوں نے بنگالیوں کے لیے انتہائی آسان زبان میں "سات ستارے" کے نام سے ایک تصنیف شائع کی۔ جس میں پاکستان کے سات معماروں کے حالاتِ زندگی درج کیے گئے۔ مرکزی حکومت کی فرمائش پر ڈاکٹر عندلیب شادانی کے ساتھ مل کر ایک کتاب لکھی جس میں مشرقی پاکستان کی تاریخ، سماج، تہذیب و ثقافت اور ادب سے متعلق دلچسپ مضامین شائع کیے گئے۔ ۱۹۶۴ء میں صوبائی سیکرٹریٹ نے ان کی خدمات عاریتاً حاصل کیں اور وہاں انہوں نے انیس اضلاع سے متعلق اردو، فارسی اور انگریزی ادبیات پر ابواب لکھے۔ بنگلہ ترقیاتی بورڈ کی جانب سے بنگلہ اردو لغت شائع کی گئی۔ اس کے حصہ اردو کی تصحیح و ترتیب کا کام انہیں کے سپرد کیا گیا۔

پروفیسر سعد منیر اور عبد الرحمان بے خود نے خاصی بڑی تعداد میں بنگلہ افسانوں کے تراجم آسان اردو میں کیے جو سرکاری سطح پر کتابی شکلوں میں شائع ہوئے۔ ان کتب پر نظر ثانی اور ترتیب کا کام بھی ان کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ سید محمد عباس کے مرتبہ ادبی تذکرے "سفینہ غزل" پر نظر ثانی کرنے کے ساتھ ساتھ ڈھاکہ سے ڈاکٹر عندلیب شادانی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی جریدے "خاور" اور ڈھاکہ ہی سے بنگلہ زبان میں شائع ہونے والے ماہ نامہ "دلربا" کے محرکوں اور منصوبہ سازوں میں شامل اور مدیرانکے شریک کار بھی رہے۔ اقبال عظیم شروع سے آخر تک "انجمن ترقی اردو" کی مجالس انتظامیہ سے وابستہ رہے اور نائب صدر کی حیثیت سے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کوشاں رہے۔ مشرقی پاکستان میں اردو کے مسائل، نیز وہاں کی نئی اور پرانی شخصیات اور ادبی سرگرمیوں سے متعلق ان کے مضامین "ادب لطیف" "ماہ نو" "نگار" اور "خاور" وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔

افسوس کہ ان کی ان تمام خدمات کو فراموش کر دیا گیا۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کے عوام میں اردو زبان و ادب کے توسط سے امن، محبت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے جتنی بھی کوششیں کیں وہ سب بے سود ثابت ہوئیں۔ اس کا انہیں بے حد رنج تھا۔ اپنے اس دکھ کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: "رنج کرنے سے بھی کیا حاصل، کہ ذکر جس جگہ کا ہے اب وہاں نہ مشرقی پاکستان ہے نہ اردو"[۳۷] اپنے اشعار میں اقبال عظیم نے اپنے وطن کے لیے چمن کا استعارہ استعمال کیا۔ پھر اسی کو سلگتے اور اجڑتے بھی دیکھا۔ اسی چمن میں انسانی قدروں اور عصمتوں کو پامال ہوتے دیکھا۔ لوٹ مار، جلاؤ گھیراؤ اور فسادات کے نتیجے میں غیر بنگالیوں کو لقمہ اجل بنتے دیکھا۔ قطب الدین عزیز نے ان دہلا دینے والے مناظر کی تصویر کشی کچھ یوں کی ہے:

> بے شمار غیر بنگالی مسافروں کو، جن میں مرد، عورتیں اور بچے شامل تھے، بنگالی مسلح دہشت گردوں نے ریل کے ڈبوں سے چن چن کر باہر نکالا، انہیں لوٹا اور اس کے بعد ان کی بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان مقتولین کی لاشیں پٹری پر پھینک دی گئیں۔[۳۸]

ایسی صورت حال میں غیر بنگالیوں کے لیے وہاں مزید رہنا کسی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ لہذا بہت سے لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر مغربی پاکستان کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ خود اقبال عظیم اور ان کے خاندان کے لیے زندگی اس

قدر صبر آزما ہو گئی کہ وہ بمشکل جان بچا کر مغربی پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔ اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

ہم سزا کے مستحق ہوتے تو کوئی غم نہ تھا
بے خطا حکمِ سزا ہو جائے تو ہم کیا کریں
ظلم سے ہم ڈر گئے، یہ تم سے کس نے کہ دیا
ظلم قانوناً روا ہو جائے تو ہم کیا کریں[۳۹]

آگ شعلوں پہ شعلے اگلتی رہی، باغ چیخا کیے، پھول روتے رہے، لوگ دیکھا کیے اور ہنستے رہے
کوئی سوچے ذرا خود یہ انصاف سے، ایسے حالات میں، ایسے ماحول میں، حفظِ ناموسِ گلشن کا امکان ہے؟[۴۰]

اقبال عظیم کو جلد ہی اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ صوبائی عصبیت کا جو زہر قیام پاکستان کے آغاز ہی میں گھول دیا گیا تھا وہ اب مشرقی پاکستان کے رگ و پے میں سرائیت کر چکا تھا اور کوئی غیر بنگالی اس کے اثر سے محفوظ نہ تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ وطنِ عزیز کے ساتھ جو سنگین مذاق کیا جا رہا ہے وہ انجام کار اپنا رنگ ضرور دکھائے گا۔ لہذا انہوں نے بحران سے پہلے ہی مغربی پاکستان ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔ اس ہجرت کے دوران بھی انہوں نے بہت سے دکھ اٹھائے۔ وہ اپنا گھر بار اور عزیز و اقارب سب چھوڑ کر سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے مغربی پاکستان پہنچے تھے۔ مشرقی پاکستان، رشتہ داروں اور دوست احباب سے دوری کا رنج ان کے درج ذیل شعر میں شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے:

آپ کے شہر میں رونق تو بہت ہے لیکن
اپنے گھر کے در و دیوار کہاں سے لاؤں[۴۱]

اقبال عظیم گو مغربی پاکستان ہجرت سے قبل بصارت کھو چکے تھے مگر اس سے ان کی حساسیت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور چشمِ بصیرت روشن تر ہو چکی تھی۔ انہوں نے پہلے ہی پیشن گوئی کر دی تھی کہ پاکستان کی قیادت جن بے حس اور مفاد پرست رہنماؤں کے ہاتھوں میں ہے، ان کی نااہلی اسے لے ڈوبے گی۔ انہوں نے ان کے لیے گُل فروش کا استعارہ

استعمال کیا ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ کبھی بھی کسی بھی وقت اپنے اقتدار کی ہوس مٹانے کے لیے وطن کا سودا کر سکتے تھے۔ ان کا یہ شعر ان کے اسی خیال کا ترجمان ہے:

؎ خدا بچائے گلستاں کو باغبانوں سے
یہ گُل فروش ہیں، ان میں کسی کا ٹھیک نہیں[۴۲]

آخر اقبالؔ عظیم کے خدشات سچ ثابت ہوئے اور گلستاں کو واقعی نظر لگ گئی۔ سیاسی رہنماؤں کے اقتدار کی ہوس ملک کو لے ڈوبی:

؎ مختصر لفظوں میں یہ ہے داستانِ کشمکش
رہبروں کی ضد میں بیچارہ وطن مارا گیا[۴۳]

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء پاکستان کی تاریخ کا وہ سیاہ ترین دن تھا جب اس کا ایک اٹوٹ انگ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو گیا۔ قومی ہی نہیں، بین الاقوامی سطح پر بھی یہ دن مسلمانوں کے لیے شرمندگی کا باعث تھا۔ ماریہ بتول اس ضمن میں رقم طراز ہیں: "سقوطِ ڈھاکہ ہماری تاریخ میں سقوطِ بغداد اور سقوطِ ہسپانیہ سے کہیں زیادہ بڑا اور المناک سانحہ ہے۔"[۴۴] اس المناک سانحے پر ہر دل غمگین اور ہر آنکھ اشک بار تھی۔ معاشرے کے حساس ترین افراد یعنی ادبا و شعرا نے اس کا گہرا اثر قبول کیا اور اپنی افسانوی و غیر افسانوی نثر اور شاعری میں اس المیے کے حوالے سے اپنے درد و کرب کا اظہار کیا۔ مثلاً:

؎ تھے بہت بے درد لمحے ختمِ دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں، مہرباں راتوں کے بعد[۴۵]

؎ عداوتیں تھیں، تغافل تھا، رنجشیں تھیں مگر
بچھڑنے والے میں سب کچھ تھا، بے وفائی نہ تھی[۴۶]

اقبالؔ عظیم کی عمر کا تو ایک بڑا حصہ مشرقی پاکستان کے گلی کوچوں میں بسر ہوا تھا۔ ان کی بہت سی یادیں اس سرزمین سے وابستہ تھیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے اس المیے نے انہیں بھی تڑپا کر رکھ دیا۔ ان کے نزدیک دین سے دوری، قرآن

وسنت کی خلاف ورزی اور باہمی اختلافات کے باعث ہمیں یہ دن دیکھنا پڑا۔ ہم نے اپنے اسلاف کے سر شرم سے جھکا دیے ہیں اور ان کا وقار مجروح کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار اسی سانحے کا ردِ عمل ہیں:

بستیاں خاموش ہیں، خلقِ خدا خاموش ہے
راستے ویران ہیں، ساری فضا خاموش ہے
مے کدوں میں رند افسردہ ہیں، پیمانے اداس
خانقاہوں میں غرورِ اتقیٰ خاموش ہے
ہم نے ناموسِ براہیمی کو رسوا کر دیا
اس خطا پر وسعتِ ارض و سماء خاموش ہے
عظمتِ اسلاف کے ماتھے پہ بل ہیں سینکڑوں
اس ہزیمت پر وقارِ کربلا خاموش ہے[۴۷]

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے نتیجے میں صدر جنرل یحییٰ خان کے خلاف ملک گیر احتجاج ہوا تو وہ بیس دسمبر ۱۹۷۱ء کو زخم خوردہ اور غم زدہ قوم کی قیادت ذوالفقار علی بھٹو کے سپرد کر کے اقتدار سے دستبردار ہو گئے۔ بھٹو نے بیس دسمبر ۱۹۷۱ء کو صدر پاکستان اور پہلے سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ انہوں نے ۲۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب کا جائزہ لینے کے لیے چیف جسٹس حمود الرحمٰن کی سربراہی میں ایک تحقیقاتی کمشن قائم کیا جسے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کا نام دیا گیا۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ پہلی مرتبہ ۱۹۷۲ء اور حتمی صورت میں ۱۹۷۴ء میں صدر کو پیش کی گئی۔ افسوس کہ اس میں بیان کیے گئے حقائق ہمیشہ عوام سے مخفی رکھے گئے اور کسی عسکری یا سویلین حکمران نے اسے حقیقی صورت میں منظر عام پر نہ آنے دیا۔ زین سہیل وارثی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب جاننے کے لیے حمود الرحمٰن کمیشن تشکیل دیا گیا، جس نے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ تیار کی۔ جو سرکاری سطح پر کبھی جاری نہ ہو سکی، نیز جو رپورٹ خفیہ طور پر ذرائع ابلاغ کے ہاتھ میں بھی آئی، اس میں سے بھی کئی اسباب حذف کر دیے گئے۔[۴۸]

اقبال عظیم کو بھی حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے منظر عام پر نہ لائے جانے کے حوالے سے تشویش تھی۔ ان کے خیال میں اس رپورٹ کے مندرجات کو عوام کے سامنے ضرور لایا جانا چاہیے تھا تاکہ ہم ان کی روشنی میں اپنا احتساب کرتے اور مستقبل میں ان اقدامات سے باز رہتے جن کی بنا پر ہمیں اس شرم ناک ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور جن کے باعث پاکستان رقبے اور آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑی اسلامی ریاست کے اعزاز سے محروم ہو گیا۔ مگر ایسا نہ ہوا اور آنے والے ہر دور میں حکمرانوں نے ان اسباب پر پردہ ڈالے رکھا۔ اقبال عظیم اس صورت حال پر اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ راتوں کو کچھ چراغوں سے چمکا دیا گیا
ہم کو سحر کے نام پہ دھوکہ دیا گیا
زنداں بھی تاکہ ہم کو گلستاں دکھائی دے
کنجِ قفس کو پھولوں سے مہکا دیا گیا
جشنِ شکست ہم نے منایا بالاہتمام
غیرت کو دھوم دھام سے دفنا دیا گیا[۴۹]

اقبال عظیم ایک حقیقت پسند شاعر تھے۔ جب کچھ لوگوں نے سانحہ مشرقی پاکستان کو تقدیر کا لکھا قرار دینے کی کوشش کی تو انہوں نے یہ ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اس لیے کہ ان کے خیال میں ہم خود اس سانحے کے ذمہ دار تھے۔ اپنی اندرونی کمزوریوں اور آپس کے اختلافات کے باعث ہم نے خود اپنے دشمن کو موقع فراہم کیا کہ وہ ہمیں اور ملکی سالمیت کو نقصان پہنچائے۔ ہم نے مقاصد کا تعین کیے بغیر ہی ہجرت کا فیصلہ کیا اور آزادی ہی کو اپنی آخری منزل سمجھ لیا۔ ہم یہ بھول گئے کہ ہماری اصل ذمہ داری آزادی کے بعد سے شروع ہوتی تھی اور ہمارا مقصد اس مملکت خداداد کی تعمیر و ترقی تھا۔ حق یہ ہے کہ ہمیں ہماری ہی غفلت کی سزا دی گئی۔ لہٰذا اب تقدیر کو الزام دینا بے سود ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کے انہیں خیالات کے غماز ہیں:

؎ قصور کس کا ہے اپنے ضمیر سے پوچھو
خدا کے واسطے تقدیر کا گلا نہ کرو[۵۰]

؎ چمن کے لوگ جب خود ہیں شریکِ گل فروشی
تو ہم اپنا نشیمن ہی بچا کر کیا کریں گے[۵۱]

؎ ہم اپنی منزلوں کا تعین کیے بغیر
کیا جانے کس خیال میں چلتے چلے گئے[۵۲]

؎ یہ سچ ہے بجلیاں بھی بارہا ٹوٹی ہیں گلشن پر
مگر اس آگ کے شعلوں کو خود ہم نے ہوا دی ہے[۵۳]

اقبال عظیم نے اس تمام صورت حال کا بغور مشاہدہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ان حالات کے ذمہ دار وہ حکمران بھی ہیں جن کی نااہلی، خود غرضی، مفاد پرستی، ہٹ دھرمی، اور بے حسی نے ملک کو اس نہج پر پہنچا دیا کہ وہاں کے باشندے ہم مذہب ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ اس ضمن میں وہ خود لکھتے ہیں:

> جہاں کہیں میں نے رہنماؤں کو حدفِ تنقید بنایا ہے وہاں بھی میرا اشارہ ان خود غرض لوگوں کی طرف ہے جنہوں نے رہنمائی کے نام پر قوم کا بیڑا غرق کیا ہے۔ اس قسم کے شعروں کو ان رہنماؤں سے ہرگز منسوب نہیں کیا جانا چاہیے جن کے خلوصِ نیت کے سب قائل ہوں اور جنہوں نے واقعی رہنمائی کا حق ادا کیا ہو۔[۵۴]

اقبال عظیم کے درج ذیل اشعار میں ایسے ہی رہنماؤں پر تنقید اور ان کے منفی رویوں اور ملک دشمن پالیسیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی ہے:

؎ نقاب پوشوں کو للہ رہنما نہ کرو
خطا کرو بھی تو اتنی بڑی خطا نہ کرو[۵۵]

؎ مسیحا اپنے ہی زخموں کا ماتم کر رہے ہیں
ہم اپنا زخمِ دل ان کو دکھا کر کیا کریں گے[۵۶]

قیامِ پاکستان کے وقت جن رہنماؤں نے رہبری کے دعوے کیے تھے وہ راستے ہی میں مسافروں کا ساتھ چھوڑ گئے، یا منزل پر پہنچ کر عہدوں اور مراعات کی ہوس میں مبتلا ہو گئے۔ انہیں غریب مہاجرین کی بے کسی اور تنگ دستی و بد حالی کا خیال تک نہ رہا۔ ایسے راہبروں کو شعرا نے راہزن کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ جنہوں نے برِ صغیر سے ہجرت کر کے آنے والے بھولے بھالے مہاجرین کو امن و مساوات اور خوش حالی کے خواب دکھا کر فریب دیا تھا اور ان کے حقوق غصب کیے تھے۔ بقول حفیظ جالندھری:

؎ رہزنوں سے تو بھاگ نکلا تھا
اب مجھے رہبروں نے گھیرا ہے[۵۷]

اقبال عظیم نے بھی اپنے متعدد اشعار میں ان رہزن نما رہبروں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جنہوں نے لوگوں کو بے وقوف بنایا اور وطنِ عزیز کی سالمیت کو داؤ پر لگا دیا۔ انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو ایسے رہنماؤں سے محتاط رہنے کی تلقین کی ہے۔ مثلاً:

؎ اے قافلے کے لوگو! ذرا جاگتے رہو
سنتے ہیں قافلے میں کوئی رہنما بھی ہے[۵۸]

نہ جانے قافلے والے ہیں کیوں خفا مجھ سے
میں صرف ایک مسافر ہوں، رہنما تو نہیں[۵۹]

ایک جگہ وطن سے محبت کا ڈھونگ رچانے والے رہنماؤں سے اپنا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ مجھے سچی محبت ہے وطن سے
میں شاعر ہوں، کوئی رہبر نہیں ہوں[۶۰]

حق گوئی و بے باکی اقبالؔ عظیم کی فطرت میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مارشل لاء کے ادوار میں ہر آمر کے غیر آئینی اقدام کی بھرپور مخالفت کی۔ نذیر حسنین زیدی ان کی شاعری کا یہ وصف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: "اقبالؔ عظیم کی شاعری میرے خیالِ ناقص میں نشانِ حق ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے اقتدار کے جھوٹے خداؤں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ہے۔"[۶۱] جنوری ۱۹۶۵ء میں جب صدر جنرل ایوب خان نے صدارتی انتخابات کا اعلان کیا تو ان کے مقابلے میں متحدہ حزب اختلاف نے محترمہ فاطمہ جناح کو صدارتی امیدوار کے طور پر نامزد کیا۔ اس انتخاب میں ایوب خان کو واضح اکثریت حاصل ہوئی۔ مگر متحدہ حزبِ اختلاف نے صدر ایوب خان کی اس کامیابی کو دھاندلی کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر صفدر محمود کی درج ذیل رائے سے بھی حزبِ اختلاف کے موقف کی تائید ہوتی ہے:

> اس عمل کے متعدد شواہد موجود ہیں کہ محترمہ فاطمہ جناح کے خلاف صدارتی انتخابات میں تمام انتظامی مشینری نے ان کی مدد کی تھی۔ ضلعی افسروں نے عوام کو ڈرا دھمکا کر ایوب خان اور اس کے ساتھیوں کے لیے ووٹ حاصل کیے تھے۔[۶۲]

اقبالؔ عظیم بھی ایک عوامی شاعر تھے اور جمہوریت کی بالادستی پر یقین رکھتے تھے۔ انہیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ محترمہ فاطمہ جناح نے حصولِ آزادی کی جدوجہد میں قائدِ اعظمؒ کے شانہ بشانہ بے پناہ خدمات انجام دی تھیں۔ پاکستان کے عوام کبھی ان کی ان خدمات کو فراموش نہیں کر سکتے تھے اور انہیں کو ملک کی سربراہی کا اہل سمجھتے تھے۔ مگر ایوب خان نے جبراً عوام کو ان کے اس جمہوری حق سے محروم کر دیا۔ لہٰذا اقبالؔ عظیم نے بھی ان صدارتی انتخابات کے نتائج تسلیم نہیں کیے اور ایوب خان کے ان جابرانہ اقدامات کی بھرپور مخالفت کی۔ ان کے درج ذیل اشعار اسی تناظر میں لکھے گئے ہیں:

پرستش اس کی فطرت ہے، یہ دیوانہ نہ بدلے گا
چراغوں کے بدل جانے سے پروانہ نہ بدلے گا
کمی ہے اس میں کرداروں کی، مقصد کی، تاثر کی
فقط سرخی بدل جانے سے افسانہ نہ بدلے گا[۶۳]

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیا الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کو برطرف کر کے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ انہوں نے بھٹو کو گرفتار کر کے ان پر نواب احمد خان کے قتل کا مقدمہ چلایا اور عدالت میں جرم ثابت ہونے پر ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو تختہ دار پر لٹکا دیا۔ بھٹو کی پھانسی کا عمل عوام کے ممکنہ ردِ عمل کے پیشِ نظر انتہائی پر اسرار انداز میں سرانجام پایا۔ اس خبر کے عام ہونے کے باوجود عوام کو احتجاج کے حق سے محروم رکھا گیا۔ اس صورت حال میں بھی اقبال عظیم خاموش نہیں رہے۔ انہوں نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ قتل کے مقدمے میں انتہائی کم وقت کی سماعت میں بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی گئی اور اس پر عمل پیرا ہونے کا فوری حکم بھی جاری کر دیا گیا:

؎ مرے جرمِ وفا کا فیصلہ کچھ اس طرح ہو گا
سزا کا حکم فوراً اور سماعت سرسری ہو گی[۶۴]

اقبال عظیم نے جنرل ضیا الحق کو قاتل قرار دیا اور اسے یہ باور کرایا کہ جرم کا سراغ مٹا دینے سے جرم مٹ نہیں جاتا بلکہ مزید ابھر کر سامنے آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

؎ قاتل نے کس صفائی سے دھوئی ہے آستیں
اس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے[۶۵]

چودھری فضل الٰہی کے استعفے کے بعد جنرل ضیا الحق ملک کے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی بن گئے۔ انہوں نے نوے دن میں ملک میں انتخابات کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر وہ مسلسل اپنے اس وعدے سے مکرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو اپنی ریڈیو ٹیلی وژن سے نشر ہونے والی ایک تقریر میں انہوں نے انتخابات کو ملکی مفاد میں غیر معینہ مدت تک کے لیے ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ انتخاب کے اس بے جواز التوا پر عوام میں غم و غصے اور مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ اقبال عظیم بھی اس تمام صورت حال سے بے خبر نہ تھے۔ انہوں نے اپنے درج ذیل اشعار میں عوام کے جذبات کی عکاسی کچھ یوں کی ہے:

؎ سنا ہے جشن ہوں گے اور گھر گھر روشنی ہو گی
مگر اب کے بھی یہ تقریب شاید ملتوی ہو گی
یہ بے مقصد سفر اب ختم ہو جاتا تو اچھا تھا
نہ تم سے رہبری ہو گی، نہ ہم سے پیروی ہو گی[۶۶]

انتخابات کو بار بار بغیر کسی وجہ کے ملتوی کرنے سے حزب اختلاف اور عوام میں تشویش بڑھنے لگی تھی۔ اس صورت حال میں صدر جنرل ضیا الحق نے اسلامی نظام کے نفاذ کا سہارا لیا۔ تاکہ عوام کی توجہ اس نظام کی جانب مبذول رہے اور ان سے انتخابات کرانے کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ بقول:

> فوجی حکومت نے اپنے دو ڈھائی سالہ دورِ اقتدار کے دوران میں جس طرح رفتہ رفتہ سیاسی سرگرمیوں کو معطل کیا اور وعدوں کے مطابق ملک میں آزادانہ انتخابات مؤخر کیا، اس سے ملک کے تمام سیاست دان اور سیاسی جماعتیں شاکی رہنے لگی تھیں۔ انتخابات، سیاسی سرگرمیوں اور آزادیوں کی بجائے جنرل ضیا الحق نے نفاذ اسلام کے سائے میں لوگوں کی عام توجہ کو ایک دوسری جانب منعطف کر رکھا تھا۔[۶۷]

اسی اسلامی نظام کے نفاذ کی آڑ میں جنرل ضیا الحق نے آئندہ پانچ برس کے لیے بھی خود کو صدر منتخب کرانے کے لیے ۱۹ دسمبر ۱۹۸۴ء کو ایک ریفرینڈم کروایا جس میں رائے دہندگان سے یہ سوال پوچھا گیا کہ کیا آپ صدر پاکستان جنرل ضیا الحق کی جانب سے ملک کے قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنے، نظریہ پاکستان کے تحفظ اور استحکام کے لیے کیے جانے والے اقدامات جاری رکھنے اور عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار کی پر امن منتقلی کی حمایت کرتے ہیں؟ عوام ملک میں جمہوریت کے خواہاں تھے۔ مگر یہاں بھی انتظامی مشینری کا ناجائز استعمال کیا گیا اور جنرل ضیا الحق عوامی امنگوں کے برخلاف ایک بار پھر ملک کے صدر منتخب ہو گئے۔

ضیا الحق نے اسلامی نظام رائج کرنے کے لیے حدود اور زکات آڈیننس جاری کیا اور شرعی عدالتیں قائم کیں۔ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے اور ملک میں نظامِ اسلام کا نفاذ کسی بھی مسلمان کے لیے انتہائی خوش آئین اقدام تھا۔ مگر اسے قانوناً نافذ کرنا سمجھ سے باہر تھا۔ خود رب العزت کا ارشاد ہے کہ "دین میں جبر نہیں ہے" تو پھر اس نظام کو جبراً کیسے نافذ کیا جا سکتا تھا؟ اقبال عظیم اس بات کا گہرا شعور رکھتے تھے کہ ضیا الحق نظامِ مصطفوی کے نفاذ کا ڈھونگ رچا کر در اصل اپنے اقتدار کو طول دینا چاہتے ہیں۔ اور بہت سے شعرا کی طرح اقبال عظیم نے بھی ضیا الحق کے جبراً نافذ کیے گئے نظام شریعت پر سخت تنقید کی ہے۔ مثلاً

> احکامِ شریعت نافذ ہیں، نافذ بھی مگر قانوناً ہیں
> یہ تلخ حقیقت ہے لیکن، اسلام ابھی سرکاری ہے[۶۸]

ایک طرف ضیا الحق کی جانب سے نظامِ شریعت کے نفاذ کا تاثر دیا جارہا تھا اور دوسری جانب درپردہ عیش و عشرت کے تمام سامان بھی مہیا کیے جارہے تھے۔ اقبال عظیم نے ملک میں رائج اس منافقانہ طرزِ حکومت پر کھل کر تنقید کی ہے اور اپنے درج ذیل اشعار میں کئی غور طلب سوالات اٹھائے ہیں:

؎ نظامِ مصطفیٰ کی بات تو کرتے ہو تم لیکن
طرب خانے کہاں جائیں گے، کاشانوں کا کیا ہو گا؟
اساسِ زندگی ٹھہرا اگر دستورِ قرآنی
تو پیمانے کہاں رکھو گے، مے خانوں کا کیا ہو گا؟
بچھے گا بوریا جب خواب گاہِ اہلِ عشرت میں
تو ان آراستہ شاہی شبستانوں کا کیا ہو گا؟[۱۹]

اس گھٹن زدہ ماحول میں بھی، جب کہ کسی کو اظہارِ رائے کی اجازت نہ تھی، اخبارات پر سینسر شپ اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد تھی، شعرا و ادبا خاموش نہیں رہے۔ اکثر ادبا نے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے علامات اور رمز و کنایہ کا سہارا لیا اور کچھ نڈر شعرا نے براہِ راست مزاحمتی انداز اختیار کیا اور حکامِ وقت کے جابرانہ نظامِ حکومت پر کھل کر تنقید کی۔ ان شعرا میں فیض احمد فیض اور حبیب جالب کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حبیب جالب نے اپنی مشہورِ زمانہ نظم میں جنرل ضیا کو ظلم اور تاریکی کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

؎ ظلمت کو ضیا، بندے کو خدا، سرسر کو صبا کیا لکھنا
پتھر کو گہر، دیوار کو در، کرگس کو ہما کیا لکھنا[۲۰]

اقبال عظیم نے بھی اس دور میں ہونے والے ظلم و جبر کی نقاب کشائی نہایت عمدگی سے کی ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں آزادیِ اظہارِ رائے کے فقدان سمیت حاکمِ وقت اور ان کے حواریوں کے تمام سفاکانہ اقدامات کے خلاف کبھی طنز کے تیر برسائے ہیں تو کبھی تند و تیز لہجہ اختیار کیا ہے۔ مثلاً

؎ قفلِ زنداں اگر تم نہیں کھولتے، کم سے کم لب کشائی کا موقع تو دو
ہم نوا گر ہیں کوئی گدا گر نہیں، ہم اسیروں کو اذنِ نوا چاہیے[۲۱]

جس نگری میں ہم رہتے تھے، سلطان وہاں کا جابر تھا
اور جبر کا اذنِ عام بھی تھا، یہ رسم وہاں جمہوری تھی [۴۲]

اقبال عظیم کے لیے یہ بات بے حد تکلیف دہ تھی کہ انہوں نے موجودہ بنگلہ دیش میں جس نسلی و لسانی تعصب کا سامنا کیا، اپنے ملک میں بھی کم و بیش اسی صورت حال سے دوچار ہوئے۔ اقبال عظیم کو اپنے اس وطن میں بھی مہاجر سمجھا گیا جس میں وہ ان گنت قربانیوں کے بعد پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ انہیں افسوس تھا کہ مسلمان اپنی قومی و ملی ذمہ داریوں سے غافل ہو کر علاقائی تعصبات میں کھو کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ انہیں پاکستان کے ہر شہری کو خواہ مہاجر ہو یا غیر مہاجر مساوی درجہ دینا چاہیے۔ ان کے درج ذیل اشعار کو حیدر آباد، کراچی اور اندرونِ سندھ کے سیاسی حالات کے تناظر میں با آسانی سمجھا جاسکتا ہے جہاں قومی وحدت پارہ پارہ ہو کر رہ گئی اور جہاں ملک دشمن عناصر نے اپنی سیاسی دکانیں چمکانے کے لیے وطن کو جہنم بنا دیا:

سب سمجھتے ہیں کہ ہم کس کارواں کے لوگ ہیں
پھر بھی پوچھا جا رہا ہے ہم کہاں کے لوگ ہیں [۴۳]

یہ تو موصوف بتائیں گے، ارادہ کیا ہے
ہم بقول ان کے مہاجر ہیں، ہمیں کیا معلوم [۴۴]

ہم نے وفا کے نام پہ کیا کچھ نہیں دیا
لیکن یہ سوچیے کہ ہمیں کیا دیا گیا [۴۵]

اس دور میں اقبال عظیم عدم تشخص کے اس المیے پر خاموش نہیں رہتے۔ بلکہ حکام وقت اور اپنے ہم وطنوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ اس مملکتِ خداداد پر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا غیر مہاجروں کا۔ اس لیے کہ اس وطن کی بنیادوں میں ان کا اور ان کے بزرگوں کا لہو بھی شامل ہیں۔ انہوں نے بھی اس چمن کی آبیاری، تحفظ اور استحکام کے لیے بے پناہ

قربانیاں دی ہیں۔ لہذا اب انہیں مہاجر و غیر مہاجر کے امتیازات سے بالاتر ہو کر پاکستان کا ایک معزز شہری تسلیم کیا جانا چاہیے۔ وہ اپنے درج ذیل اشعار میں انتہائی جارحانہ اور بے باکانہ انداز میں اپنے اس حق کے لیے آواز بلند کرتے ہیں:

؎ اپنے ماتھے پہ بل ڈال کر تم ہمیں، شیش محلوں کے اندر سے جھڑکی نہ دو
ہم بھکاری نہیں ہیں کہ ٹل جائیں گے، ہم کو اپنی وفا کا صلہ چاہیے
تم نے آرائشِ گلستاں کے لیے، ہم سے کچھ خون مانگا تھا مدت ہوئی
تم سے خیرات تو ہم نہیں مانگتے، ہم کو اس خون کا خوں بہا چاہیے[۷۶]

اقبال عظیم کے لیے یہ بات انتہائی رنج کا باعث تھی کہ کچھ شر پسند عناصر اپنی سیاست چمکانے کے لیے ملک میں انتشار پھیلا رہے تھے۔ یہ لوگ وطنِ عزیز کا امن کسی طور برقرار نہیں رہنے دینا چاہتے تھے۔ اپنے اس ناپاک عزم کی تکمیل کے لیے یہ کبھی صوبائی و علاقائی، کبھی مہاجر و غیر مہاجر اور کبھی نسلی و لسانی اختلافات کو ہوا دے کر ملک میں نفرت کی آگ بھڑکاتے رہے اور کبھی مسالک کی بنیاد پر خانہ جنگی کی فضا پیدا کرتے رہے۔ افسوس کہ ہماری قوم شعور سے کام لینے کی بجائے انہیں ملک دشمن عناصر کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہی۔ اپنی قوم کے اس رویے پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے اقبال عظیم کہتے ہیں:

؎ ملتِ بیضا نے یہ سیکھا ہے صد ہا سال میں
یہ یہاں کے لوگ ہیں اور وہ وہاں کے لوگ ہیں[۷۷]

مسئلہ اس کو بنا لیتے ہیں ہم اہلِ زباں
ورنہ آپس میں عداوت خود زبانوں میں نہیں[۷۸]

اقبال عظیم بحیثیت مصلح قوم اپنے ہم وطنوں کو خبر دار کرتے ہیں کہ ہم ماضی میں باہمی خانہ جنگی کے سنگین نتائج سانحہ مشرقی پاکستان کی صورت میں بھگت چکے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اس سے عبرت حاصل کرتے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہم اب بھی اپنی زبانوں سے ایک دوسرے کے لیے زہر اگل رہے ہیں۔ ہماری نفرت کی آگ ٹھنڈی ہی نہیں پڑ رہی۔ ہمارے دل اتنی لاشیں دیکھ کر بھی نہیں دہلے۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ اگر ہم نے متحد

ہو کر آپس کی رنجشیں دور نہ کیں تو دشمن کو ایک بار پھر ہمیں اور ملکی سالمیت کو نقصان پہنچانے کا موقع مل جائے گا اور ہم اس آزاد وطن سے محروم ہو جائیں گے۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کے انہی خیالات کے غماز ہیں:

؎ اب زباں سے نہ شعلے بھڑکاؤ
شہر پہلے ہی جل چکا ہے بہت
اب تو آتش فشاں بجھا ڈالو
اب تو لاوا ابل چکا ہے بہت
اس کا تریاق اب ضروری ہے
زہر دشمن اگل چکا ہے بہت[۷۹]

اوپر کی سطور میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اقبال عظیم علامہ اقبالؒ کے افکار سے بہت متاثر تھے۔ اسی لیے ان کے متعدد اشعار میں انہیں افکار کا پرچار ملتا ہے۔ علامہ اقبال اس بات کے قائل تھے کہ اقوام کی ترقی کا انحصار ان کے باہم متحد ہونے اور دفاعی استحکام پر ہے۔ ان اقوام کے نزدیک اندرونی و بیرونی تحفظ کو بنیادی جبکہ رقص و سرود کی محافل کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں:

؎ میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر[۸۰]

اقبال عظیم کو اس بات کا بے حد افسوس تھا کہ ملک اندرونی و بیرونی سازشوں کی بنا پر دولخت ہو گیا، لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے اور ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ وطنِ عزیز کی سالمیت اب بھی خطرے میں ہے اور سیاسی و معاشی عدم استحکام عروج پر۔ لیکن اس کے باوجود ہماری قوم جشن منانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ کبھی جشنِ بہاراں کا اہتمام کیا جاتا ہے تو کبھی جشنِ چراغاں کا۔ ملک جس آگ کی لپیٹ میں ہے اسے بجھانے کی فکر کسی کو نہیں۔ اپنے اس رنج کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

؎ خوش خیالی میں نشیمن نہ سجاؤ پہلے
آبرو صحنِ گلستاں کی بچاؤ پہلے

بعد میں جشنِ چراغاں کا تکلف کرنا
گھر میں جو آگ لگی ہے، وہ بجھاؤ پہلے[۸۱]

کوئی بھی شاعر یا ادیب اپنے معاشرے سے الگ تھلگ ہو کر نہیں رہ سکتا۔ وہ اسی معاشرے کا ایک باشعور اور حساس فرد ہوتا ہے جو تخلیقی فن پاروں کے ذریعے اپنے معاشرے میں پروان چڑھنے والے متنوع رویوں، مسائل اور اقدار کی سچی تصویر پیش کرتا ہے۔ اقبال عظیم کی شاعری بھی اپنے معاشرے میں پنپنے والے رویوں اور مسائل کی ترجمان ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اس خوبصورتی سے اصلاحِ قوم کا فریضہ سرانجام دیا ہے کہ اس میں تغزل کا کوئی عنصر مجروح نہیں ہونے پاتا اور غزل کی دل آویزی بھی برقرار رہتی ہے۔ انہوں نے جہاں کہیں اپنی غزلوں میں قوم کو نصیحت کی ہے، وہاں بھی غیر ناصحانہ انداز اختیار کیا ہے اور کہیں مشورہ دیا ہے تو مشیر نہیں بلکہ مبصر بن کر۔

اقبال عظیم نے اپنے ہم وطنوں کو یہ باور کرانے کی سعی کی ہے کہ یہ پیارا وطن لازوال قربانیاں دے کر محض اس لیے حاصل کیا گیا تھا کہ ہم بحیثیت مسلمان اس میں اپنی زندگیاں قرآن و سنت کے سنہری اصولوں کے مطابق گزاریں۔ مگر افسوس کہ ایسا ہوتا نظر نہیں آرہا۔ بدقسمتی سے ہم نے حصولِ پاکستان کا مقصدِ حقیقی فراموش کر دیا ہے اور کھلے عام اللہ اور اپنے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کی حکم عدولی کر رہے ہیں۔ اقبال عظیم اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں احکامِ شریعہ کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔ کلام اللہ اور احادیث کی کتابوں کو محض طاقوں کی زینت بنا کر نہیں رکھ دینا چاہیے بلکہ ان پر صدقِ دل سے عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اسی پر ہماری فلاحِ دارین کا انحصار ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی اسی اصلاحی فکر کے عکاس ہیں:

پیروی چاہتا ہے جادہ قرآن و حدیث
ان صحیفوں کو فقط گھر میں سجا مت دینا[۸۲]

خلاف ورزی احکامِ مصطفیٰ نہ کرو
خطا کرو بھی، تو اتنی بڑی خطا نہ کرو[۸۳]

اقبال عظیم کے خیال میں کہنے کو تو ہم مسلمان ہیں، اللہ کی عبادت بھی کرتے ہیں اور دوسروں کو نیکیوں میں سبقت لے جانے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہماری روح اسلام سے خالی ہے۔ ہم نے جگہ جگہ مساجد تو تعمیر کرلی ہیں مگر ان پر بت خانوں کا گمان ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہم محض جسمانی طور پر اللہ کے حضور سر بسجود ہوتے ہیں لیکن ہماری سوچ اور دھیان کہیں اور ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

؎ بنامِ دینِ ابراہیم بس اتنا کیا ہم نے
کہ بت خانے سے ملتی جلتی اِک مسجد بنا دی ہے[۸۴]

؎ مسجد جو ابھی حال میں تعمیر ہوئی ہے
کعبہ ہی لگے ہے، نہ صنم خانہ لگے ہے[۸۵]

اقبال عظیم ماضی کے سنہری اصولوں اور روایات کی پاسداری کے دل سے قائل ہیں اور اس سے منحرف نہیں ہوتے، مگر زندگی کے حوالے سے ان کا نقطہ نظر بڑا واضح ہے۔ اسی لیے وہ آنکھیں بند کرکے کسی کی اندھی تقلید بھی نہیں کرتے۔ وہ صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے میں تذبذب کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ نہ صرف خود معاشرتی ناہمواریوں اور طبقاتی امتیازات کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، بلکہ اوروں کو بھی جبر و استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ مثلاً

؎ عہدِ حاضر کی ہر اِک بات ہمیں دل سے قبول
صرف توہینِ روایت نہیں ہو گی ہم سے[۸۶]

ایک تنہا میرے ذمے کیوں ہے کارِ احتجاج
بولنا سب جانتے ہیں، بولتا کوئی نہیں[۸۷]

جو بات دل میں ہے، بے خوف کیوں نہیں کہتے
زبان و قلب میں کچھ ایسا فاصلہ تو نہیں[۸۸]

اقبال عظیم نے اپنے ملک کے حالات پر ایک حساس محبِ وطن کی حیثیت سے تنقید کی ہے۔ ان کے خیال میں عہدِ حاضر کے عام چلن کے مطابق ہمارے معاشرے میں بھی مادیت پرستی عروج پر پہنچ چکی ہے۔ آج کا انسان ہر شے کو مادی پیمانوں پر پرکھتا ہے۔ ستم یہ ہے کہ بات صرف اشیا تک محدود نہیں رہی، بلکہ اب دوستی، قرابت داری اور خونی رشتوں کو بھی مادی پیمانوں سے ناپنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دوسرا یہ کہ انسان پر پیسہ کمانے کی دھن اس قدر سوار ہے کہ وہ اس کے لیے کسی بھی حد سے گزر جاتا ہے۔ رشوت، سفارش، سمگلنگ، ذخیرہ اندوزی یا ملاوٹ اس کی نظر میں کوئی عیب ہی نہیں۔ اس صورت حال پر طنز کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

ہم وفائیں کر کے رکھتے ہیں وفاؤں کی امید
دوستی میں اس قدر سوداگری بھی جرم ہے[۸۹]

جو لوگ نظر سیل ہوئے، ان کا غم نہیں
شہروں کے لوگ خوش ہیں، کہ دریا اتر گئے[۹۰]

یہاں مٹی بھی آمیزش زدہ ہے
یہ آبادی ہے شاید تاجروں کی[۹۱]

اقبال عظیم ضمیر فروشی کو ایک بہت بڑی اخلاقی برائی سمجھتے ہیں۔ اس کا ایک بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ مشرقی پاکستان سے ہجرت کے دوران بھی انہیں گھر بار لٹا کر آنے کے غم سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ اپنا ضمیر بچا کر لے آئے ہیں اور وہ اب تک زندہ ہے۔ وہ کہتے ہیں:

یہ کیا بتائیں کہ ہم کیا گنوا کے آئے ہیں
بس اِک ضمیر بہ مشکل بچا کے لائے ہیں[۹۲]

قیام پاکستان کے بعد انہوں نے بالخصوص بہت سے لوگوں کو ضمیر فروشی جیسی برائی کا مرتکب ہوتے دیکھا۔ وہ اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ لوگ اتنی آسانی سے کیسے اپنے ضمیر کا سودا کر لیتے ہیں اور انہیں اس جرم کا احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ لوگ جو اصول پسند ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، اب ضمیر بیچ کر اپنے اصولوں پر سمجھوتہ کر چکے ہیں اور اس پر انہیں کوئی ملال بھی نہیں۔ ایسے ضمیر فروشوں پر طنز کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

؎ اپنا ضمیر بیچ کے نیند آ گئی ہمیں
سارے اصول خوابوں میں ڈھلتے چلے گئے[۹۳]

؎ وہ بد نصیب، جسے سب ضمیر کہتے ہیں
سنا ہے اس نے کہیں چھپ کے خودکشی کر لی[۹۴]

اقبال عظیم نے ملک میں رائج سماجی ناہمواریوں اور طبقاتی تضادات کے خلاف بھی بھرپور صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ وہ اس بات پر شدید کڑھتے ہیں کہ ملک چند لوگوں کی جاگیر بن کر رہ گیا ہے اور معیشت پر طبقہ اشرافیہ کی اجارہ داری ہے۔ نتیجۃً امیر امیر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ امیروں کے محلات اور حکمرانوں کے ایوان تو ہر نعمت اور سہولت سے آراستہ ہیں، مگر غریبوں کے گھر کا اندھیرا رخصت نہیں ہوتا۔ امیر طبقے کی بے حسی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ غرباء کا کوئی مددگار نہیں جو ان کی بدحالی کو خوش حالی میں بدلنے کی تدبیر کر سکے۔ اقبال عظیم طبقہ اشرافیہ کی اس بے حسی پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ ان سے کوئی کیا کہے بے خواب غم خانوں کا حال
ساری نیندیں وقف ہیں جن خواب گاہوں کے لیے[۹۵]

؎ جام و سبو سے نظم شبستاں، ایوانوں کی قسمت میں
خونِ جگر سے سعی چراغاں، غم خانوں کی قسمت میں[۹۶]

؎ یہ آندھی کیا کرے گی کوٹھیوں کا
الٰہی خیر ہو کچے گھروں کی[97]

کبھی کبھار غربا کے اس درجہ استحصال پر اقبال عظیم کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور وہ پکار اٹھتے ہیں:

؎ جس گھر کو میسر نہ ہو مٹی کا دیا بھی
اس گھر کو تو بہتر ہے کوئی آگ لگا دے[98]

انہوں نے اپنی غزلوں میں معاشرے کے نچلے طبقوں کے مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ وہ غربا کو بھوک سے تڑپتا نہیں دیکھ سکتے اور انہیں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اگر تمہارے پاس اشیائے خورونوش خریدنے کو روپے نہ ہوں تو ہاتھ میں پتھر اٹھاؤ اور اس سے درختوں کے پھل توڑ کر اپنے پیٹ کا دوزخ بھر لو:

؎ جیب خالی ہے تو کیا، پتھر اٹھا لو ہاتھ میں
تازہ پھل پیڑوں پہ ہوتے ہیں، دکانوں میں نہیں[99]

اقبال عظیم کا یہ ماننا ہے کہ بلاشبہ امیروں اور غریبوں کے طرزِ زندگی میں بے پناہ فرق ہے۔ امرا کو لاکھ آسائشیں میسر ہوں مگر وہ سکونِ قلب کی دولت سے محروم رہتے ہیں۔ جو خلوص و اطمینان غریب کی جھونپڑی میں ہے وہ سنگِ مرمر سے تعمیر شدہ محلات میں ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ وہ جس دولت سے تعمیر ہوتے ہیں، وہ دراصل غربا کا خون نچوڑ کر ہی حاصل کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی دولت اور سہولیات سے اطمینان قلب تو نصیب نہیں ہو سکتا۔ اپنے ان خیالات کا شعری اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

؎ اب بھی مل سکتا ہے وہ نیچے گھرانوں میں تمہیں
جو خلوصِ بے ریا اونچے گھرانوں میں نہیں
ایک محنت کش کی ٹوٹی جھونپڑی کو جو ہے نصیب
وہ خلوصِ قلب مرمر کے مکانوں میں نہیں[100]

اقبال عظیم نے اپنے متعدد اشعار میں ان افرادِ معاشرہ کی حقیقت بھی آشکار کی ہے جو غریبوں، کمزوروں، پریشان حالوں اور بیماروں کی غم خواری اور مسیحائی کا دعویٰ تو ضرور کرتے ہیں، مگر جب ان سے کوئی اپنے دکھ درد کی دوا اور

بیماری سے شفا طلب کرتا ہے تو وہ اپنے ہی زخموں کا رونا رونے لگتے ہیں۔ ان کی بے حسی کا عالم یہ ہے کہ کسی مریض کی بیماری طول پکڑ جائے تو وہ سوتے میں زہر اس کے جسم میں اتار دیتے ہیں اور کوئی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ان کے سامنے دم توڑ دے تو بھی انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسے مسیحاؤں کی مسیحائی کا پردہ چاک کرتے ہوئے اقبال عظیم کہتے ہیں:

؎ چارہ گر کھو گئے، نیند آ گئی غم خواروں کو
اپنی روداد سنائیں کسے، دیواروں کو؟
اب مسیحائی کا آسان طریقہ یہ ہے
زہر دے دیتے ہیں سوتے ہوئے بیماروں کو[۱۰۱]

اقبال عظیم نے معاشرے میں پروان چڑھنے والی منفی اقدار کی شدید مزاحمت کی ہے۔ وہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم نے اور بہت سی مثبت اقدار کی طرح حقِ ہمسائیگی کو بھی فراموش کر دیا ہے۔ نفسا نفسی کے اس عہد میں بے حسی اس قدر بڑھ چکی ہے کہ ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کی نہ خبر گیری کرتا ہے اور نہ ہی اس کے دکھ درد اور تکلیف میں شریک ہونا گوارا کرتا ہے۔ گھروں کی قربت کا یہ عالم ہے کہ دیوار سے دیوار ملی ہے، مگر دلوں کی قربتیں ہیں کہ مٹتی ہی چلی جا رہی ہیں۔ ان کے یہ اشعار معاشرے کی اسی قدر کی پامالی کے عکاس ہیں:

؎ اس طرح ایک نیا شہر ہوا ہے آباد
ربطِ ہمسائیگی باقی نہیں گھر کا گھر سے[۱۰۲]

؎ جو نظر بچا کے گزر گئے، مرے سامنے سے ابھی ابھی
یہ مرے ہی شہر کے لوگ تھے، مرے گھر سے گھر ہے ملا ہوا[۱۰۳]

اقبال عظیم ایک درویش صفت انسان تھے۔ معاشرے کے عام چلن کے برخلاف انہیں زمانہ سازی کا ہنر نہیں آتا تھا۔ ان کی چشمِ باطن بخوبی اندازہ کر سکتی تھی کہ اس فن میں مہارت رکھنے والے افراد عہدے، مراعات اور حکامِ وقت کی خوشنودی حاصل کر رہے ہیں مگر اقبال عظیم اپنی خوددار فطرت سے مجبور تھے۔ وہ چاہ کر بھی نہ زمانہ سازی کے ہنر میں

مہارت حاصل کر سکے اور نہ کسی کی خوشامد کر کے اعلیٰ مراتب کے حصول میں کامیاب ہو سکے۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں:

؎ زمانہ سازی کا فن ہم نے کیوں نہیں سیکھا
ہم اہلِ ظرف ہیں خود اپنی جان کے دشمن[۱۰۴]

؎ منصب تو ہمیں بھی مل سکتے تھے، لیکن شرط حضوری تھی
یہ شرط ہمیں منظور نہ تھی، بس اتنی سی مجبوری تھی[۱۰۵]

اقبال عظیم جیسے حساس شاعر کے لیے یہ بات بھی انتہائی تکلیف دہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں حق داروں کو ان کے اصل حق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ ایسا بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے کہ اہل افراد کو ان کا وہ جائز مقام مل جائے جس کے وہ مستحق ہوں۔ حکامِ بالا اور بڑے بڑے عہدہ داران میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو قطعاً اس کے اہل نہیں ہیں۔ ان کے اس مقام تک پہنچنے میں یا تو ان کی دولت اور اثر و رسوخ کا عمل دخل ہوتا ہے، یا وہ کسی بڑے آدمی کے منظورِ نظر ہوتے ہیں۔ ایسے افراد ہر شے کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور عوام کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ ہم با اختیار لوگ ہیں۔ جو چاہیں کر سکتے ہیں اور کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ایسے لوگوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ اربابِ کم نظر بھی ہیں جلووں سے فیض یاب
دیدہ وروں سے دیدہ وری چھین لی گئی[۱۰۶]

؎ خالی پیمانے لیے بیٹھے ہیں رندانِ کرام
مے کدہ ان کا ہے جو پیرِ مغاں کے لوگ ہیں
گل فروشی سے انہیں ہم روکنے والے ہیں کون
ہم چمن کے لوگ ہیں، وہ باغ باں کے لوگ ہیں[۱۰۷]

اقبال عظیم کی غزلوں کے مطالعے سے جو بات واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں منافقوں اور ان کے دہرے معیارات سے سخت نفرت ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں نقاب، نقاب پوش اور آستین جیسے الفاظ بار بار استعمال ہوئے ہیں۔ وہ دوست پر دشمن کو اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ وہ کھل کر دشمنی نبھاتا ہے اور تصنع سے کام نہیں لیتا۔ انہیں دشمن سے زیادہ ان لوگوں سے خوف محسوس ہوتا ہے جو دہری چالیں چلتے ہیں اور کھل کر اپنے بغض و عداوت کا اظہار نہیں کرتے۔ اقبال عظیم ایسے منافقین سے محتاط رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ کبھی بھی اور کسی بھی وقت نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی حقیقت وہ اپنے اشعار میں کچھ یوں آشکار کرتے ہیں:

کم سے کم اس کی عداوت میں تصنع تو نہیں
دل سے ممنون ہوں اقبال میں بیگانے کا[۱۰۸]

میری مانو تو اِک بات تم سے کہوں، یہ نیا دور ہے، اس کا کیا ٹھیک ہے
دوستوں سے ملو محفلوں میں مگر، آستینوں کا بھی جائزہ چاہیے[۱۰۹]

اپنے دشمن سے ہمیں اقبال کوئی ڈر نہیں
ان سے بے شک خوف ہے، جو درمیاں کے لوگ ہیں[۱۱۰]

اقبال عظیم نے حکمرانوں اور ان زاہدوں کا اصل چہرہ بھی بے نقاب کیا ہے جو بظاہر زہد و تقویٰ کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں مگر در پردہ ملک و ملت کی ساکھ کو اپنی بد اعمالیوں کے سبب بری طرح مجروح کر رہے ہیں۔ ان کے درج ذیل اشعار میں انہیں سیاست دانوں اور پرہیز گاروں پر طنز کے تیر برسائے گئے ہیں:

شیوخِ شہر کو تم دیکھ کر پلٹ آئے
کسی سے پوچھ تو لیتے، وہ مے کدہ تو نہیں[۱۱۱]

لاکھ ڈالی گئی چہروں پہ تقدس کی نقاب

لوگ پہچان گئے حاشیہ برداروں کو[۱۲]

؎ جھوٹ بھی بولیں، صداقت کے پیمبر بھی بنیں
ہم کو بخشو، یہ سیاست نہیں ہو گی ہم سے[۱۳]

اقبال عظیم کی شاعری کے مطالعے کے دوران اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ان کے کچھ مخالفین ہیں جو ان کی دل آزاری کرتے ہیں اور انہیں نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔ لیکن وہ اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے دشمن کو بھی نفرت کا جواب نفرت سے نہیں دیتے بلکہ عدو کا ذکر بھی اس محبت سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے اس نوع کے اشعار کو محض ان کی ذات تک محدود سمجھنا مناسب نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ ذاتی حوالے سے کہے گئے یہ اشعار بھی اجتماعی سطح پر اعلیٰ معاشرتی اقدار کے فروغ کا وسیلہ ثابت ہو سکتے ہیں:

؎ تعلق اب بھی ہے باقی پرانے دوستوں سے
نئے لوگوں کو ہم دشمن بنا کر کیا کریں گے

؎ اقبال دشمنوں کی ضرورت نہیں ہمیں
کافی ہیں دوستوں کے خصوصی کرم ابھی[۱۴]

؎ دوستی سے ہم جوابِ دشمنی دیتے رہے
اس طرح اقبال تادیبِ عدو ہوتی رہی[۱۵]

اقبال عظیم کی شاعری کا خاصا یہ ہے کہ وہ صرف معاشرے کی خرابیوں پر نوحہ کناں ہی نہیں ہوتے، بلکہ انہیں دور کرنے کا قرینہ بھی سکھاتے ہیں۔ بقول نذیر صدیقی:

وہ قوم کی زبوں حالی کے مرثیہ خواں نہیں، بلکہ اس کے دکھ درد کے معالج ہیں۔ وہ نہایت
درد مندی اور دل سوزی کے ساتھ ان امراض کی تشخیص کرتے ہیں۔ یا وہ جن خطرات
میں گھری ہوئی ہے، ان کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔[۱۱۶]

اقبال عظیم کے نزدیک دل آزاری اور دل شکنی دونوں گناہ ہیں لہذا ان سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان کے خیال میں کسی سے عداوت رکھنا تو خیر ہے ہی غلط، مگر دوستی اور محبت میں بھی اعتدال سے کام لینا چاہیے۔ بحیثیت انسان اور بحیثیت مسلمان ہمیں دوسروں سے خلوصِ دل سے ملنا چاہیے اور حقوق العباد کی ادائیگی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھنی چاہیے۔ کسی مریض کی تیمار داری مصلحتاً نہیں بلکہ اللہ کی رضا کی خاطر کرنی چاہیے۔ سچائی کردار کا حسن ہے، مگر ایسی سچائی سے، جس سے کسی کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو گریز ہی بہتر ہے۔ انسان کو اس قدر نازک مزاج نہیں ہونا چاہیے کہ وہ معمولی شکر رنجی کو نہ ختم ہونے والی رنجشوں میں بدل دے۔ انسان کو ہر حال میں اپنے رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ نہ امیر کو دولت پر مغرور ہونا چاہیے اور نہ ہی غریب کو مفلسی پر نادم ہونا چاہیے۔ ملک میں ایسا آئین حکومت نافذ نہیں ہونا چاہیے جو عہدوں کی خاطر سیاسی رہنماؤں کو سربازار لڑا دے۔ ان کے درج ذیل اشعار افرادِ معاشرہ کو فکر و عمل کی ترغیب دیتے ہیں:

؎ تسلیم کہ آپس میں عداوت بھی غلط ہے
جو حد سے سوا ہو تو محبت بھی غلط ہے
کردار کا اِک حسن صداقت بھی ہے لیکن
جو آگ لگا دے، وہ صداقت بھی غلط ہے
تھوڑی سی شکر رنجی کو رنجش میں بدل دے
اس درجہ مزاجوں میں نزاکت بھی غلط ہے[۱۱۷]

اقبال عظیم کا دل وطن اور اہلِ وطن کی محبت سے سرشار ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سب آپس میں مل جل کر رہیں اور ملک امن کا گہوارا بن جائے۔ اپنی اسی خواہش کی تکمیل کے لیے انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو کچھ کارآمد مشورے دیے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر وہ نہ صرف خود کامیاب ہو سکتے ہیں بلکہ ملک کو بھی ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتے ہیں۔ وہ انہیں نصیحت کرتے ہیں کہ اگر تم سے جانے انجانے میں کوئی خطا ہو جائے تو بلا حیل و حجت اس کا اعتراف کر لو تاکہ محاذ آرائی کو

جلانہ ملے۔ کسی دوسرے سے کوئی چوک ہو جائے تو اسے درگزر کر دو اور خطا تمہاری ہو تو معافی مانگ لو۔ اگر تمہارے سامنے کوئی جرم کا مرتکب ہوا ہو تو اس کا انکشاف کرو۔ اس لیے کہ شہادت سے پہلو تہی بذاتِ خود ایک بہت بڑا جرم بلکہ گناہ ہے۔ بدگمانیوں کو اپنے دل میں جگہ نہ دو۔ اگر کسی دوست یا عزیز کے لیے دل میں کدورت پیدا ہو بھی جائے تو اسے پہلی فرصت میں دور کرو۔ کسی معاملے میں حق بجانب ہو تو بے خوف ہو کر اپنے موقف کا اظہار کرو اور بلاوجہ کسی پر نقطہ چینی نہ کرو۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کے انہیں خیالات کے عکاس ہیں:

؎ قصور تم سے ہوا ہو تو اعتراف کرو
یہ کیا ضرور کہ بے وجہ اختلاف کرو
خود ایک جرم ہے پہلو تہی شہادت سے
کسی نے جرم کیا ہو تو انکشاف کرو
کسی سے چوک اگر ہو تو بخش دو اس کو
مگر تمہاری خطا ہو تو اعتراف کرو[۱۸]

اقبال عظیم اپنے ہم وطنوں کو تیز رفتاری سے زندگی میں آگے بڑھتا دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ وہ انہیں ظلمتِ شب کو سحر میں بدلنے کے لیے اپنے ہی لہو سے چراغ روشن کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ہر ہم وطن کے کردار میں اس درجہ پختگی اور صداقت ہو کہ ان کا ہر عیب زمانے کو ہنر معلوم ہونے لگے۔ اپنے ان خیالات سے قوم کو بہرہ ور کرتے ہوئے اقبال عظیم کہتے ہیں:

؎ راستے مختصر نہیں ہوں گے
اپنی رفتار تیز تر کر دو
کر کے روشن لہو سے سارے چراغ
شبِ تاریک کو سحر کر دو
اپنے کردار کو جلا دے کر
اپنے ہر عیب کو ہنر کر دو[۱۹]

اقبال عظیم بھی علامہ اقبال کی طرح زندگی میں جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم کے قائل ہیں۔ وہ گفتار سے بڑھ کر کردار کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ ایک سچے مومن کی حیثیت سے دعا کی قبولیت پر کامل ایمان تو ضرور رکھتے ہیں، مگر دعا کے ساتھ دوا کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک تدبیر کے بغیر تقدیر کو موردِ الزام ٹھہرانا سراسر ناانصافی ہے۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو بار بار یہ یاد دہانی کراتے ہیں کہ تم ایک شان دار ماضی کے امین ہو۔ تمہارے اجداد نے ایک عالم پر حکومت کی ہے۔ لہذا یہ تمہارے شایان شان نہیں کہ تم دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاؤ۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کے انہیں خیالات کے آئینہ دار ہیں:

؎ تمہارا نام ہے منسوب کج کلاہوں سے
گدا گروں کی طرح عرضِ مدعا نہ کرو
دعا بھی صرف عزائم کا ساتھ دیتی ہے
دوائے درد بھی ڈھونڈو، فقط دعا نہ کرو[۱۲۰]

؎ اپنے مشکوک ارادوں کی زیاں کاری پر
اپنی تقدیر کو الزامِ خطا مت دینا[۱۲۱]

اقبال عظیم کی غزل کا ایک نمایاں وصف اپنے قاری اور سامع سے تخاطب بھی ہے۔ یوں ان کی غزل ایک سماجی عمل بن جاتی ہے۔ ایسا سماجی عمل جس میں خدشات بھی ہیں اور مستقبل کی تعبیر کے خواب بھی۔ ان کے آخری دور کی غزلوں میں یہ تخاطب ایک دردمندانہ رفاقت میں بدل جاتا ہے۔ سید ابوالخیر کشفی اس بابت لکھتے ہیں:

> وہ اپنے قاری اور ہم وطن ساتھی کو غزل کے لہجے میں مشورہ دیتے ہیں۔ اپنی ذات سے قریب رہنے کا مشورہ، رفاقت کے فریب میں مبتلاہ ہونے سے بچنے کا مشورہ، اپنی مٹی سے قربت کا مشورہ اور وہ مشورہ دیتے ہوئے اپنے قاری کو یہ تسلی بھی دیتے ہیں کہ وہ ایک زندہ روایت کا امین ہے۔[۱۲۲]

سید ابوالخیر کشفی کے مندرجہ بالا الفاظ کی تائید اقبال عظیم کے درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے۔

اپنے مرکز سے اگر دور نکل جاؤ گے
خواب ہو جاؤ گے، افسانوں میں ڈھل جاؤ گے
دے رہے ہیں تمہیں جو لوگ رفاقت کا فریب
ان کی تاریخ پڑھو گے تو دہل جاؤ گے
اپنی مٹی ہی پہ چلنے کا سلیقہ سیکھو
سنگِ مرمر پہ چلو گے تو پھسل جاؤ گے
تم ہو اِک زندۂ جاوید روایت کا چراغ
تم کوئی شام کا سورج ہو کہ ڈھل جاؤ گے[۱۲۳]

مندرجہ بالا اشعار اور ناقدین کے اقوال کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال عظیم کی غزل اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کی عکاس ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں ملک کو درپیش مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے، سیاسی رہنماؤں کی ملک دشمن پالیسیوں پر بے لاگ تنقید کی ہے اور ان جھوٹے خداؤں کی حاکمیت اور حکومت کا اصل چہرہ بھی بے نقاب کیا ہے جنہوں نے رہنمائی کے نام پر ملک و قوم کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔ انہوں نے معاشرے میں پائی جانے والی بہت سی خرابیوں کی نشان دہی بھی کی ہے اور بحیثیت مصلح اپنے ہم وطنوں کو ان کے تدارک کے حوالے سے مفید مشورے بھی فراہم کیے ہیں۔ ان کی شاعری میں جو جاذبیت اور اثر پذیری ہے اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات و واقعات سے قریبی تعلق رکھتی ہے۔ ان کے کلام میں ان کے عہد کی سیاسی و سماجی صورت حال کا عکس بھی ہے اور اس صورت حال کے حوالے سے اس عہد کے انسان کا ردِ عمل بھی۔ یہ تمام حقائق اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ اقبال عظیم کی غزلیں اپنے عہد کے عصری شعور کی ترجمان ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ مزمل حسین، معاصر سیاسی و سماجی صورت حال میں شاعر اور ادیب کا کردار،

http://www.tajziat.com/article/10572 ,8:51am,20june2022

۲۔ مرزا مظہر جان جاناں http://www.rekhta.com

20june2022,12:54pm

۳۔ میر تقی میر، کلیات میر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء)، ص ۲۶۔

۴۔ خواجہ میر درد، دیوان درد مرتبہ ظہیر احمد صدیقی (دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۶۳ء)، ص ۱۶۹۔

۵۔ عبدالباری آسی، کلیات نظیر اکبر آبادی (لاہور: مکتبہ شعر و ادب، ۱۹۸۶ء)، ص ۶۸۰۔

۶۔ اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر (آغاز سے ۱۸۵۷ء تک)، http://www.ur.wikipedia.org

20june2022,1:10pm

۷۔ محمد خرم، ادب اور سیاسی شعور، http://alhamd.aiu.edu.pk

20june2022,1:20pm

۸۔ شمیم حنفی، غالب کا طرز احساس اور سماجی شعور کا مسئلہ http://www.rekhta.org

20june2022,1:25pm

۹۔ اکبر الہ آبادی، http://www.rekhta.org

20june2022,1:35pm

۱۰۔ حمید اللہ ہاشمی، شرح بانگ درا (جہلم: پرنٹرز پبلی شر اینڈ بک سلرز، ۲۰۱۷ء)، ص ۵۱۱۔۵۱۲۔

۱۱۔ گوپی چند نارنگ، شعر حسرت کی سیاسی جہات پر ایک نظر http://www.rekhta.org

20june2022,1:40pm

۱۲۔ حسرت موہانی، دیوان حسرت (لاہور: خیام پبلی شرز، ۱۹۸۷ء)، ص ۷۰۔

۱۳۔ ایضاً، ص۵۸۔

۱۴۔ رشید احمد گوریجہ، اردو میں تاریخ ناول (لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۴ء)، ص۲۰۶۔

۱۵۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل (کراچی: توکل اکیڈمی کاشانہ خلیل، ۲۰۱۰ء)، ص۷۲۔

۱۶۔ فاران، کراچی، (مئی ۱۹۸۷ء) ص۶۳۔

۱۷۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص۳۵۔

۱۸۔ نظیر صدیقی، "اقبال عظیم"، روشنائی، کراچی (۳۰ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷)، ص۱۶۳۔

۱۹۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص۹۳۔

۲۰۔ ایضاً، ص۱۶۲۔

۲۱۔ ایضاً، ص۲۱۹۔

۲۲۔ ایضاً، ص۲۵۴۔

۲۳۔ ایضاً، ص۹۰۔

۲۴۔ ایضاً، ص۱۴۷۔

۲۵۔ ایضاً، ص۱۹۷۔

۲۶۔ ایضاً، ص۲۰۹۔

۲۷۔ ایضاً، ص۲۱۰۔

۲۸۔ ایضاً، ص۸۸۔

۲۹۔ ایضاً، ص۱۰۴

۳۰۔ ایضاً، ص۸۴۔

۳۱۔ ایضاً، ص۸۹۔

۳۲۔ ایضاً، ص۲۱۰۔

۳۳۔ ایضاً، ص۲۸۱۔

۳۴۔ کمال متین الدین، tragedy of errors، مترجم ڈاکٹر شیر از دستی (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص ۳۷۔

۳۵۔ عنایت اللہ، ہماری شکست کی کہانی (لاہور: حکایت پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۴۹۔

۳۶۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء)، ص ۵۸۴۔

۳۷۔ اقبال عظیم، کلیات غزل مأحصل، ص ۳۹۔

۳۸۔ قطب الدین عزیز، خون اور آنسوؤں کا دریا مترجمین سلیم منصور خالد، ظہور احمد قریشی (لاہور: دی میسج پریس، ۲۰۱۷ء)، ص ۲۶۱۔

۳۹۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۸۶۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۶۴۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۲۹۰۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۹۳۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۴۶۴۔

۴۴۔ ماریہ بتول، غیر افسانوی ادب میں سقوط ڈھاکہ کی عکاسی بحوالہ خصوصی صدیق سالک اور مسعود مفتی ایم ایس اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۱۷۔

۴۵۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، ۱۹۸۹ء)، ص ۲۰۔

۴۶۔ نصیر ترابی، http://www.rekhta.org

20june2022,1:50pm.

۴۷۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۱۲۸۔۱۲۹۔

۴۸۔ زین سہیل، سقوط ڈھاکہ اور ہم، http://www.humsub.com.pk

24june2022,11:35am

۴۹۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۱۳۱۔۱۳۲۔

۵۰۔ ایضاً، ص ۱۲۲۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۲۴۔

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۳۴۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۳۰۶۔

۵۴۔ ایضاً، ص ۲۸۔

۵۵۔ ایضاً، ص ۱۲۸۔

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۲۴۔

۵۷۔ حفیظ جالندھری، کلیات حفیظ جالندھری مرتبہ خواجہ محمد ذکریا (نئی دہلی: فرید بک ڈپو، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۰۔

۵۸۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۱۱۳۔

۵۹۔ ایضاً، ص ۲۹۵۔

۶۰۔ ایضاً، ۴۱۲۔

۶۱۔ نظیر حسنین زیدی، شخصیت و مباحث (کراچی: مکتبہ مسعود، ۱۹۸۳ء)، ص ۴۷۔

۶۲۔ صفدر محمود، پاکستان تاریخ و سیاست (لاہور: جنگ پبلیشرز، ۱۹۹۰ء)، ص ۲۸۸۔

۶۳۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۸۸۔

۶۴۔ ایضاً، ص ۳۰۷۔

۶۵۔ ایضاً، ص ۱۱۲۔

۶۶۔ ایضاً، ص ۳۰۷۔

۶۷۔ دلشاد اجمل، حبیب جالب ادبی خدمات ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد، س۔ن۔، ص ۹۵۔

۶۸۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۳۸۰۔

۶۹۔ ایضاً، ص ۴۰۶، ۴۰۵۔

۷۰۔ حبیب جالب،کلیات حبیب جالب(لاہور:ماورا پبلی کیشنز،۱۹۹۳ء)،ص۱۸۱۔

۷۱۔ اقبال عظیم،کلیات غزل ماحصل،ص۲۹۳۔

۷۲۔ ایضاً،ص۳۶۱۔

۷۳۔ ایضاً،ص۱۳۲۔

۷۴۔ ایضاً،ص۳۳۶۔

۷۵۔ ایضاً،ص۳۳۸۔

۷۶۔ ایضاً،ص۲۹۲۔

۷۷۔ ایضاً،ص۳۳۶۔

۷۸۔ ایضاً،ص۴۶۳۔

۷۹۔ ایضاً،ص۴۷۸۔

۸۰۔ علامہ محمد اقبال،کلیات اقبال(لاہور:مکتبہ جمال،۲۰۱۲ء)،ص۶۲۳۔

۸۱۔ اقبال عظیم،کلیات غزل ماحصل،ص۳۳۷۔

۸۲۔ ایضاً،ص۳۸۴۔

۸۳۔ ایضاً،ص۳۹۵۔

۸۴۔ ایضاً،ص۳۰۶۔

۸۵۔ ایضاً،ص۳۲۱۔

۸۶۔ ایضاً،ص۳۶۹۔

۸۷۔ ایضاً،ص۳۵۵۔

۸۸۔ ایضاً،ص۸۲۔

۸۹۔ ایضاً،ص۴۵۱۔

۹۰۔ ایضاً،ص۳۴۷۔

۹۱۔ ایضاً، ص ۸۹۔

۹۲۔ ایضاً، ص ۱۳۳۔

۹۳۔ ایضاً، ص ۲۹۸۔

۹۴۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔

۹۵۔ ایضاً، ص ۲۴۲۔

۹۶۔ ایضاً، ص ۴۵۰۔

۹۷۔ ایضاً، ص ۳۰۰۔

۹۸۔ ایضاً، ص ۴۶۲۔

۹۹۔ ایضاً، ص ۴۶۲۔

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۳۲۴۔

۱۰۱۔ ایضاً، ص ۳۰۳۔

۱۰۲۔ ایضاً، ص ۳۱۱۔

۱۰۳۔ ایضاً، ص ۱۴۲۔

۱۰۴۔ ایضاً، ص ۳۶۱۔

۱۰۵۔ ایضاً، ص ۷۳۔

۱۰۶۔ ایضاً، ص ۳۳۶۔

۱۰۷۔ ایضاً، ص ۲۲۷۔

۱۰۸۔ ایضاً، ص ۲۹۲۔

۱۰۹۔ ایضاً، ص ۳۳۶۔

۱۱۰۔ ایضاً، ص ۱۴۶۔

۱۱۱۔ ایضاً، ص ۳۲۴۔

۱۱۲۔ ایضاً، ص۳۶۹۔

۱۱۳۔ ایضاً، ص۱۲۵۔

۱۱۴۔ ایضاً، ص۲۵۱۔

۱۱۵۔ ایضاً، ص۱۸۲۔

۱۱۶۔ فاران، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص۶۳۔

۱۱۷۔ ایضاً، ص۴۶۶۔

۱۱۸۔ ایضاً، ص۴۵۸۔

۱۱۹۔ ایضاً، ص۴۴۹، ۴۴۸۔

۱۲۰۔ ایضاً، ص۱۲۲۔

۱۲۱۔ ایضاً، ص۳۸۳۔

۱۲۲۔ ابوالخیر کشفی، "اقبال عظیم کی غزل میں مسلسل ارتقا نظر آتا ہے"، روشنائی، کراچی (۳۰ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷) ص۱۵۴۔

۱۲۳۔ ایضاً، ص۳۸۲، ۳۸۱۔

باب چہارم:

اقبال عظیم کی غزلوں میں خودداری ورجائیت

اقبال عظیم اردو ادب کے نامور شاعر ہیں۔ ان کی غزلیں متنوع جہات کی حامل ہے۔ ان کے کلام میں فکری اعتبار سے بے پناہ وسعت اور تنوع پایا جاتا ہے۔ عشقِ مجازی و حقیقی اور حبِ رسول ﷺ سے لے کر حب الوطنی اور حبِ انسانیت تک محبت کے تمام رنگ اور لہجے ان کی غزلوں میں موجود ہیں۔ ان کے ہاں ذاتی اور اجتماعی درد و غم کی باز گشت سنائی دیتی ہے۔ علاوہ ازیں ان کی غزلیں ان کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کی تصویر پیش کرتی ہیں اور ان کے عصری شعور کی ترجمان بھی ہیں۔ گزشتہ ابواب میں ان کی شاعری میں تصورِ محبت، درد و غم کی نوعیت اور سیاسی و سماجی شعور کا مطالعہ تفصیل سے کیا جاچکا ہے۔ زیرِ تحقیق باب میں اقبال عظیم کی غزلوں میں خودداری ورجائیت کے عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ سلام سندیلوی خودداری کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> خودداری ایک فطری جذبہ ہے جو انسان سے اسی طرح چسپاں رہتی ہے جس طرح پھول میں خوشبو بسی ہوتی ہے یا چراغ میں روشنی موجود ہوتی ہے۔ خودداری کا تعلق انسان کی داخلی شخصیت "inner self" سے ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت ایک شریف انسان کی علامت ہے جو خوش گوار روجحان کی غمازی کرتا ہے۔[1]

خوددار انسان مایوسی کا شکار نہیں ہوتا۔ زندگی اور حالات سے متعلق رجائی نقطہ نظر ہی اسے ہر آن آگے بڑھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ امید کی کرن ہی اسے سمندر کی گہرائیوں اور تاریکیوں، کڑکتے جاڑے اور چلچلاتی دھوپ میں سہارا دیتی اور اطمنان بخشتی ہے۔ اسے یہ احساس کڑی سے کڑی آزمائش میں بھی مایوسیوں کے گڑھے میں دھکیلے جانے سے محفوظ رکھتا ہے کہ ہر غم کے بعد خوشی، ہر ناکامی کے بعد کامیابی اور ہر رات کے بعد سحر ضرور طلوع ہوتی ہے۔ لہذا انسان کو کبھی اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ظلمت کتنی ہی گہری ہو، آخر چھٹ جاتی ہے۔ ڈاکٹر رابعہ سرفراز رجائیت کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں: "زندگی کے مصائب کے باوجود صبر اور امید کا دامن ہاتھ

سے نہ چھوڑنا اور رکاوٹوں کے باوجود مقصد کے حصول کے لیے نیک نیتی سے آگے بڑھتے جانا رجائیت ہے۔"[۲] مذکورہ بالا دونوں جذبات انسان میں جینے کا حوصلہ اور آگے بڑھنے کی امنگ پیدا کرتے ہیں۔ اگر معاشرے کے کسی عام فرد میں خودداری و رجائیت کے جذبات بدرجہ اتم موجود ہوں تو وہ انفرادی طور پر زندگی میں پیش آنے والے مسائل و مصائب کا مقابلہ کرنے اور انہیں شکست فاش دے کر آگے بڑھنے میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔ لیکن اگر یہی جذبات کسی رہنما، شاعر یا ادیب میں پائے جائیں تو پوری قوم اور سارے معاشرے کی تقدیر سنور سکتی ہے اور اس کے افراد میں اپنے کسی بھی جائز اور تعمیری مقصد کے حصول کا جذبہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔

دنیا کے ہر بڑے ادب کی طرح اردو ادب کی تاریخ بھی ایسے شعرا سے بھرپور ہے جنھوں نے زندگی میں پیش آنے والے نامساعد حالات کا نہ صرف جواں مردی سے مقابلہ کیا، بلکہ اپنے قارئین کو بھی آزمائشوں پر ثابت قدم رہنے، مشکلات سے خائف نہ ہونے اور کسی بھی صورتحال میں امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنے کا پیغام دیا۔ ذیل کی سطور میں چند اہلِ سخن کے افکار کا مطالعہ خودداری و رجائیت کے تناظر میں کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

خواجہ میر دردؔ کو اردو ادب کا پہلا باقاعدہ صوفی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کا خاندان دلی میں پیری مریدی کے حوالے سے مشہور تھا۔ والد خواجہ ناصر عندلیبؔ کی وفات کے بعد دردؔ سجادہ نشین ہوئے اور خلقِ خدا کو فیض پہنچایا۔ ان کے مزاج میں خودداری و رجائیت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک درویش منش انسان تھے۔ صبر، شکر، توکل، قناعت اور دنیا کی بے ثباتی جیسے احساسات نے انہیں ہر شے سے بے نیاز کر دیا۔ بادشاہ اور حکمران ان سے ملاقات کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے تھے، مگر دردؔ کے نزدیک اس سب کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ ایک سچے موحد تھے۔ بتوں کے آگے سر بسجود ہونا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ انہیں بظاہر زہد و تقویٰ کا لبادہ اوڑھ کر عبادت کا ڈھونگ رچانے والوں سے سخت چڑ تھی۔ انہیں کسی کا احسان گوارا نہیں تھا۔ وہ محبوب سے بھی بے نیازی برتتے ہیں۔ اگر وہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو یہ بھی محبت میں کمی کرنے لگتے ہیں۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کے انہیں جذبات کے عکاس ہیں:

؎ یگانہ ہے تُو آہ بیگانگی میں
کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا[۳]

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں[۴]

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے، آن میں کچھ ہے[۵]

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا شمار بلاشبہ اردو ادب کے عظیم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ اپنی جدت طبع اور ندرت خیال کے باعث انہیں جو مقام حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ انانیت و خودداری ان کے مزاج میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کی جھلک ان کے کلام میں بھی بخوبی محسوس کی جاسکتی ہے۔ بحیثیت مجموعی غالبؔ کو جو بات ان کے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی انانیت اور زندگی کے حوالے سے ان کا رجائیت پسندانہ رویہ ہے۔ غالبؔ عشق کے قائل ہیں اور محبوب کے ناز بھی اٹھانے کو تیار ہیں۔ مگر اس شرط پر کہ ان کی خودداری پر حرف نہ آنے پائے۔ وہ محبوب کو مناتے نہیں کہ اس میں ان کی سبک سری کا پہلو نکلتا ہے۔ وہ دیگر شعرا کے برعکس محبوب کی شانِ بے نیازی کا جواب بے نیازی سے نہیں بلکہ بھرپور توجہ سے دیتے ہیں۔ وہ اہلِ زمانہ کے ظلم و ستم اور غموں کی تاب نہ لاکر خوب اشک بہاتے ہیں اور یہ بھی نہیں چاہتے کہ کوئی ان کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرے۔ وہ مصائب سے اس لیے نہیں گھبراتے کہ انہیں ان کے خوشیوں میں بدل جانے کا یقین ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کے انہیں افکار کے عکاس ہیں:

؎ وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں، کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو[۶]

؎ ہم بھی تسلیم کی خُو رکھتے ہیں
بے نیازی تری عادت ہی سہی[۷]

دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں[8]

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا[9]

خواجہ حیدر علی آتش لکھنؤ کے نمائندہ شاعر ہیں۔ لیکن اپنے ہم عصر شعرا کی نسبت ان کی غزلوں میں خارجیت کے برعکس داخلیت کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ طبعاً و عملاً ایک درویش منش انسان تھے۔ صبر و ضبط، توکل، قناعت اور خودداری و وضع داری ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف تھے۔ وہ واجد علی شاہ کے اتالیق ہونے کی بنا پر ہر تین ماہ بعد معقول تنخواہ پاتے تھے اور انہیں نواب غازی الدین حیدر کی جانب سے وظیفہ بھی ملتا تھا۔ مگر وہ یہ ساری رقم راہِ خدا میں خرچ کر دیا کرتے تھے اور خود اکثر فاقہ کشی اختیار کرتے تھے۔ کوئی شاگرد مالی معاونت کی جسارت کرتا تو اس کی پیشکش بھی قبول نہ کرتے۔ ان کی خودداری کا عکس ان کے کلام میں بھی واضح طور پر نظر آتا ہے۔ سلام سندیلوی اس ضمن میں لکھتے ہیں: "آتش کی زندگی اور شاعری میں ہم کو زیادہ بعد نظر نہیں آتا۔ جس طرح ان کی نظر خودداری کے ستاروں سے چمک رہی ہے، اسی طرح ان کی شاعری خودداری کے پھولوں سے مہک رہی ہے۔۔"[10] آتش کو کسی کا احسان بھی گوارا نہیں ہے۔ انہیں بوریا تختِ سلیماں سے زیادہ پسند ہے۔ وہ اپنے قارئین کو اللہ پر بھروسہ رکھ کر آگے بڑھنے کی تلقین کرتے ہیں اور اسے یہ باور کراتے ہیں کہ بس اللہ کا نام لے کر سفر کا آغاز کر دو۔ منزل پر پہنچانے کا انتظام وہ خود فرمادے گا۔ محبت کے معاملات میں بھی وہ انتہائی خوددار واقع ہوئے ہیں۔ وہ خود ہی محبوب کو خط نہیں لکھتے۔ ورنہ انہیں اپنا نامہ محبت محبوب تک پہنچانے کے لیے سینکڑوں کبوتروں کی خدمات حاصل ہو سکتی ہیں۔ وہ محبوب کے تغافل کو اپنے حق میں اس لیے خوش آئین سمجھتے ہیں کہ اس سے انہیں محبوب کا شرمندہ احسان نہیں ہونا پڑتا۔ اپنے درج ذیل اشعار میں وہ کہتے ہیں:

بادشاہی سے فقیری کا ہے رتبہ بالا
بوریا چھوڑ کے کیا تختِ سلیماں مانگوں
میں ہی اپنے شوق کا نامہ اسے لکھتا نہیں

اُڑ کے لے جانے کو حاضر ہیں کبوتر سینکڑوں
اٹھاؤں کس لیے احسانِ یار گردن پر
مرا تو اس کے تغافل سے کام ہوتا ہے[11]

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے[12]

حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ بیسویں صدی کے عہد ساز شاعر اور فلسفی ہیں۔ ان کی شاعری سر بسر خودداری و رجائیت کا پیغام ہے۔ ان کا تصور خودداری اردو ادب کے تقریباً سبھی شعرا سے منفرد اور وسعت کا حامل ہے۔ ان کے شعری تصورات میں فلسفہ خودی کو مرکزیت حاصل ہے۔ وہ انسان کو خودی میں ڈوب کر اپنے آپ کو جاننے پہچاننے، اپنی خوابیدہ و پوشیدہ صلاحیتوں کے ادراک اور اسرار ہائے زندگی معلوم کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ انسان کو اللہ رب العزت کی احسن تخلیق قرار دیتے ہیں اور اس سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے نائب کی حیثیت سے اپنے جملہ فرائض بطریق احسن نبھائے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ملک و ملت کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کرے۔ اقبالؒ اپنی قوم کے افراد میں جذبہ حریت ابھارتے اور انہیں غلامی کی زنجیریں توڑ پھینکنے کا درس دیتے ہیں۔ اس لیے کہ غلام قوم کی کوئی وقعت نہیں ہوتی اور وہ دنیا میں ذلیل و رسوا ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ امتِ مسلمہ کو صرف خدائے واحد کی اطاعت و بندگی کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ غیر اللہ کے سامنے جھکنے اور دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کی بھی سختی سے ممانعت کرتے ہیں:

؎ مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر[13]

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تُو جھکا جب غیر کے آگے، نہ من تیرا، نہ تن[14]

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل، کہ تُو
قطرہ ہے لیکن، مثالِ بحر بے پایاں بھی ہے[15]

اقبالؔ ایک رجائیت پسند شاعر ہیں۔ حالانکہ انہوں نے جس دورِ غلامی میں ہوش سنبھالا اور شعور کی منازل طے کیں، اس میں تمام مسلمانانِ برِ صغیر پر مایوسی اور قنوطیت کا غلبہ تھا۔ انہیں انگریزوں اور ہندوؤں کے ظلم و جبر سے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ قوم کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور دوسری جانب حکمران بھی اپنی قوم کی کاہلی اور غلامی پر قناعت سے بے زار ہو چکے تھے۔ ایسے میں علامہ اقبالؒ نے سفینہ قوم کو نہ صرف سہارا دیا بلکہ اسے پار لگانے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔ بقول افتخار احمد صدیقی:

> دنیائے علم و فن میں ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی، کہ کوئی مفکر یا شاعر ایک پر آشوب دور سے تعلق رکھتا ہو، اس کی قوم گوں نگوں خطرات اور مشکلات میں گری ہوئی ہو، وہ حالات کی سنگینی کا گہرا شعور رکھتا ہو، اس کا دل غمِ ملت اور دردِ انسانیت سے معمور ہو اور پھر بھی اس کا پیغام و کلام، کلامِ اقبالؔ کی طرح رجائیت کا ایک سدا بہار گلشن ہو۔[16]

اقبالؔ نے اپنی ولولہ انگیز شاعری کے ذریعے مسلمانانِ برِ صغیر کی مردہ رگوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ انہیں یہ احساس دلایا کہ وہ دنیا کی بہترین قوم ہیں۔ اگر وہ اپنی ذات کا عرفان حاصل کر لیں اور متحد ہو کر حصولِ آزادی کے لیے جدوجہد کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ انگریزوں، ہندوؤں اور کسی بھی دوسری قوم کے غلام رہیں۔ انہوں نے حکمرانوں کو بھی قوم کی حالتِ زار سے مایوس نہ ہونے کی تلقین کی اور انہیں یہ باور کروایا کہ مسلمانانِ برِ صغیر سست ضرور ہیں لیکن اگر آج بھی ان میں ایمان کی چنگاری بھڑک اٹھی تو وہ جلد ہی جابر اقوام سے چھٹکارا اور اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لیں گے۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی اسی رجائی فکر کے ترجمان ہیں:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو، تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی[17]

نومید نہ ہو ان سے، اے رہبر فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن، بے ذوق نہیں راہی[18]

نوا پیرا ہو اے بلبل، کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا[19]

فیض احمد فیض کو میر، غالب اور اقبال کے بعد اردو ادب کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں بھی خودداری ور جائیت کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ فیض گو ترقی پسند شاعر تھے۔ مگر انہیں جو بات دیگر ترقی پسند شعرا سے ممتاز کرتی ہے، وہ ان کا دھیما لب ولہجہ ہے۔ ان کے ہاں غم کی دھیمی دھیمی آنچ سلگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری پر تند و تیز نعروں کا گمان نہیں ہوتا۔ فیض کی شاعری مختلف ارتقائی منازل سے گزر کر رومان سے انقلاب میں داخل ہوئی۔ اگرچہ ان کی شاعری میں رومانویت اور دردِ عشق کی کسک برابر محسوس کی جاسکتی ہے، تاہم ان کی بعد کی شاعری میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر غربت، استحصال، جبر و استبداد، طبقاتی اونچ نیچ، اقتصادی بد حالی، قتل و غارت اور حکمرانوں کی بے حسی وغیرہ جیسے مسائل کثرت سے بیان ہوئے ہیں۔ فیض کو اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کے لیے یہ بات انتہائی تکلیف دہ تھی کہ مسلمانانِ برِ صغیر نے جن خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے آگ و خون کا دریا عبور کر کے پاکستان ہجرت کی تھی وہ چکنا چور ہو رہے تھے اور عوام میں غم و غصہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس تمام تر صورت حال میں فیض صاحب نے مظلوم عوام کے حقوق کے حصول اور حکمرانوں کے ظلم و جبر کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی۔ اس جرم کی پاداش میں انہیں کئی بار قید و بند اور جلاوطنی کی اذیتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ لیکن انہوں نے اپنا مشن جاری رکھا، پابندی اظہارِ رائے کے باوجود حق گوئی کو اپنا شعار بنایا اور تمام حکمرانوں کی ملک دشمن پالیسیوں کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ فیض صاحب زندگی کو اللہ کی امانت سمجھتے ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن یہ ختم ہو جائے گی۔ لہذا موت کی پروا کیے بغیر اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لیے کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ وہ اپنے قارئین کو بھی جان کی پروا کیے بغیر حق پر ڈٹے رہنے اور جبر و استحصال کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ مثلاً

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں [۲۰]

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے [۲۱]

اِک طرزِ تغافل ہے، سو وہ تم کو مبارک
اِک عرضِ تمنا ہے، سو ہم کرتے رہیں گے [۲۲]

عمر بھر تلخ حالات سے نبرد آزما رہنے کے باوجود فیض کی شاعری میں قنوطیت کا عنصر نمایاں نہیں بلکہ رجائیت کا رنگ غالب ہے۔ انہیں امید ہے کہ جلد ہی خزاں بہار میں بدل جائے گی، ظلمتیں چھٹ جائیں گی اور ملک میں خوشیوں سے بھرپور سحر طلوع ہو گی۔ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک اللہ رب العزت کہلائے گا، جبکہ وطنِ عزیز پر "خلقِ خدا" راج کرے گی اور حکمران کٹہرے میں کھڑے ہو کر عوام پر کیے گئے ظلم و جبر کا حساب دیں گے۔ اپنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی

جو منظر بھی ہے ناظر بھی
اٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلق خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو[۲۳]

مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ جن اہلِ سخن نے اس روایت کے فروغ میں اپنا کردار ادا کیا ان میں شاہ حاتمؔ، فغاںؔ، سوداؔ، میرؔ، ناسخؔ، مومنؔ، میر انیسؔ، داغؔ، فانیؔ، حسرتؔ، یگانہؔ، جگرؔ، احمد ندیمؔ قاسمی اور اقبالؔ عظیم کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اقبالؔ عظیم کا شمار اردو ادب کے اہم غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے کے دوران دو باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ وہ ایک حوصلہ مند انسان ہیں۔ تمام عمر آلام و مصائب سے دوچار رہنے کے باوجود وہ نہ تو خود کبھی رحمتِ خداوندی سے مایوس ہوئے اور نہ ہی انہوں نے اپنے قارئین کو قنوطیت کا شکار ہونے دیا۔ ان کے اشعار انتہائی ہمت افزا ہیں۔ انہیں پڑھ کر قاری حوصلہ، ولولہ اور جینے کی امنگ حاصل کرتا ہے۔ دوم یہ کہ وہ مزاجاً ایک خوددار انسان ہیں۔ معاملہ خواہ عشق و محبت کے لطیف جذبات کے اظہار کا ہو یا خود پر گزرنے والی غم انگیز کیفیات کا، معذوریِ چشم کے نتیجے میں جنم لینے والی تکالیف کا بیان ہو یا مالی پریشانیوں کا ذکر، دورانِ ہجرت دربدری کی اذیتوں سے دوچار ہونے کا تذکرہ ہو یا سیاسی رہنماؤں کی ظلم و بربریت اور بے حسی کی بات، ضبط و احتیاط اور خودداری کا دامن کبھی ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ خودداری اقبالؔ عظیم کی شاعری کا سب سے بڑا وصف ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ گو ان سے پہلے، ان کے ہم عصر اور ان کے بعد آنے والے شعرا کے ہاں بھی ہمیں اس جذبے کا اظہار کسی نہ کسی صورت میں ملتا ہے، مگر اقبالؔ عظیم کا انداز ان سے منفرد ہے۔ انہوں نے زندگی میں بے پناہ ٹھوکریں کھائیں، ان گنت مسائل کا شکار رہے اور زمانے کی ناقدری و بے اعتنائی کا سامنا بھی کیا لیکن اس کے باوجود ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ انہوں نے

جواں مردی سے زندگی میں پیش آنے والے جملہ مسائل کا مقابلہ کیا اور انہیں شکست فاش دی۔ سید ابو الخیر کشفی اقبال عظیم کی غزل کی اسی خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ان کے لہجے میں جرات، اعتماد اور زندگی سے پنجہ کشی کی ادا بھی نظر آتی ہے۔ اردو غزل میں حوصلہ مندی کی روایت کئی اور شاعروں کے ہاں بھی ملتی ہے۔ آتش، غالب، یگانہ سے لے کر قرار نورسی ،صہبا اختر، سرشار صدیقی، پیرزادہ قاسم اور عہدِ حاضر کے جواں تر شاعروں تک۔ لیکن پروفیسر اقبال عظیم کے ہاں کسی آواز کی تکرار نہیں۔ ان کا کلام ان کی ذات کی صدائے بازگشت بھی ہے اور آئینہ بھی۔ ایک سید کی درویشی، ایک استاد کا اعتماد اور تمکنت، ایک شریف النفس آدمی کا ضبط اور احتیاط۔ یہ ہیں ان کی آواز کے چند پہلو۔[۲۴]

اقبال عظیم کا درج ذیل شعر بھی سید ابو الخیر کشفی کے اس قول کی بھرپور تائید کرتا ہے:

؎ ناموسِ روایت بھی، سیادت بھی، انا بھی
صد شکر کہ ہر چیز سلامت ہے ہماری[۲۵]

غزل اور عشق بڑی حد تک ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اس لیے ہر سخن ور خصوصاً اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں عشق و محبت کو اپنی غزلوں کا موضوع بناتا ہے۔ اقبال عظیم کی ابتدائی دور کی غزلوں پر بھی رومانویت کا رنگ غالب ہے۔ ان کے ہاں حسن و عشق کا بیان انتہائی دلکش انداز میں کیا گیا ہے۔ ان کے اس نوع کے اشعار اردو غزل کی روایت کا تسلسل بھی ہیں اور ان کی کتابِ زیست کے اوراق بھی۔ میر کو ان کے والد نے نصیحت فرمائی تھی کہ بیٹا عشق اختیار کرو، کہ یہ نورِ حیات بھی ہے اور نارِ حیات بھی۔ اقبال عظیم کی غزل بھی ہماری ذات کی تعمیر کرتی اور محبت کرنے اور بانٹنے کا درس دیتی ہے۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں جگر مراد آبادی ادبی دنیا اور مشاعروں کے مقبول ترین شاعر تھے۔ بہت سے شعرا ان کے اندازِ غزل گوئی و غزل سرائی سے بے حد متاثر تھے۔ اقبال عظیم کی اس دور کی غزلوں پر بھی جگر صاحب کے طرزِ سخن کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ مثلاً:

؎ اِک موجِ تبسم ہونٹوں پر، اِک نغمۂ رنگیں آنکھوں میں
تم رشکِ ثریا کیا سمجھو، تم بربتِ زہرا کیا جانو
تخریبِ محبت آساں ہے، تعمیرِ محبت مشکل ہے
تم آگ لگانا سیکھ گئے، تم آگ بجھانا کیا جانو[۲۶]

اقبال عظیم کی شاعری کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے ہاں عشق کے معاملات میں پندارِ محبت کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ اسی بنا پر ان کی شاعری میں خودداری اور صبر و ضبط کے پہلو دیگر شعرا کی نسبت زیادہ نمایاں ہیں۔ اس ضمن میں چند شعری مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

؎ بے نیازانہ گزر جائے گزرنے والا
میرے پندار کو اب شوقِ تماشا بھی نہیں[۲۷]

؎ شکستِ ظرف کو پندارِ رندانہ نہیں کہتے
جو مانگے سے ملے ہم اس کو پیمانہ نہیں کہتے[۲۸]

؎ آپ سے ہم کو بے شک بہت انس ہے، اپنے پندار کو ہم مگر کیا کریں
اپنی توہین ہم کو گوارا نہیں، آپ بدلے تو ہم بھی بدل جائیں گے[۲۹]

اقبال عظیم محبوب سے نہ تو محبت کا تقاضا کرتے ہیں اور نہ ہی اس سے الطاف و عنایات کی بھیک مانگتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر محبوب کو عاشق کی پر خلوص محبت پر بھروسہ نہ ہو تو اس سے تعلقات استوار رکھنا مناسب نہیں ہے۔ وہ عرضِ مدعا کے قائل نہیں۔ اس لیے کہ اس سے ان کی انا کی توہین ہوتی ہے اور خودداری کا بھرم قائم نہیں رہتا۔ ان کے خیال میں محبت سچی ہو تو محبوب سے حالِ دل کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ وہ خود سمجھ جاتا ہے کہ اس کے عاشق پر اس کی بے رخی و بے اعتنائی اور جدائی میں کیا گزر رہی ہے۔ اپنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

ان کو جب خود ہی نہ ہو اقبال اپنوں کا خیال
بے حیا بن کر کہو ہم مدعا کیسے کہیں[۳۰]

میرے خلوص پر جو بھروسا نہ ہو تمہیں
مجھ کو تعلقات پہ اسرار بھی نہیں[۳۱]

اپنی اُفتادِ طبیعت کو میں آخر کیا کروں
اور سب ممکن ہے، عرضِ مدعا ممکن نہیں[۳۲]

نہ میں کوہ کُن ہوں، نہ قیس ہوں، مجھے اپنی جان عزیز ہے
مجھے ترکِ عشق قبول ہے، جو تمہیں یقینِ وفا نہ ہو[۳۳]

اقبالؔ عظیم محبوب سے اظہارِ تمنا پر ترکِ تمنا کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ اس کے بدلے انہیں تمام عمر غم سے دوچار رہنا پڑے۔ ان کے خیال میں حالِ دل بیان کر دینے سے عاشق کی کوئی وقعت نہیں رہتی اور اگر محبوب اس کی تمنا کو نظر انداز کر دے تو وہ اس کے ساتھ ساتھ خود اپنی نظروں میں بھی حقیر بن کر رہ جاتا ہے۔ اقبالؔ عظیم کے لیے محبوب کی بے رخی ناقابلِ برداشت ہے۔ وہ اسے بے رخی کا جواب بے رخی سے دینے کے قائل ہیں۔ اگر محبوب ان کے سلام کا جواب نہیں دیتا تو وہ بھی اسے بار بار سلام کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ وہ محبت کے عوض محبت کے خواہاں ہیں۔ انہیں الطفات کے نام پر محبوب کا غفلت برتنا کسی طور گوارا نہیں۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کے انہیں احساسات و جذبات کے عکاس ہیں:

اک عرضِ تمنا کی خاطر، نظروں سے کسی کی کیوں گرتے
ہم ترکِ تمنا کر بیٹھے، قسمت میں غمِ پیہم ہی سہی[۳۴]

جواب جب بھی ملا ہم کو، بے رخی سے ملا

سلام اب نہیں ہوں گے، بہت سلام ہوئے[۳۵]

؎ جو التفات کی اِک شکل ہے تغافل بھی
تو التفات کو میرا سلام اے ساقی[۳۶]

اقبالؔ عظیم محبوب سے اپنی محبت کا والہانہ اظہار کرتے ہوئے اس کی یادوں کو سرمایہ زیست قرار دیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اسے یہ باور بھی کرا دیتے ہیں کہ وہ بے کس و مجبور نہیں بلکہ ایک جرات مند عاشق ہیں اور محبوب کی یادوں کو کسی بھی لمحے بھلا دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ محبوب کے عطا کردہ غم کو اپنے لیے چراغِ راہ ضرور خیال کرتے ہیں۔ لیکن اگر چاہیں تو کسی بھی لمحے تسکینِ انا کی خاطر اسے گُل بھی کر سکتے ہیں۔ اپنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

؎ تمہاری یاد میری زندگی ہے، یہ تسلیم
مگر میں چاہوں تو تم کو بھلا بھی سکتا ہوں
تمہارا غم مرے حق میں چراغِ راہ سہی
میں اس چراغ کو ضد میں بجھا بھی سکتا ہوں[۳۷]

اقبالؔ عظیم اپنے محبوب کے ناز زیادہ نہیں اٹھاتے۔ انہیں اس کا روٹھنا ناگوار گزرتا ہے۔ وہ اسے بار بار منانے کے اس لیے قائل نہیں ہیں کہ اس طرح روٹھنا اس کا معمول بن جائے گا اور اسے ہر بار منانے سے خود اقبالؔ عظیم کی انا مجروح ہو گی۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں:

؎ وہ جب بھی ذرا روٹھا، چپ بیٹھے رہے ہم بھی
اک بار منا لیتے، تو روز خفا ہوتا[۳۸]

؎ گاہے گاہے کوئی روٹھے تو سر آنکھوں پہ مگر
روز روٹھے کوئی تو روز منانے سے رہے[۳۹]

اقبال عظیم محبوب کے حسن و جمال کے پرستار تو ہیں، مگر انہیں اس سے ایک حریفانہ کشاکش بھی ہے۔ وہ اپنے محبوب کے حسین و جمیل ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے اسے بھرپور خراج تو پیش کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی اسے یہ باور بھی کرا دیتے ہیں کہ یہ حسن و جمال ایک عارضی شے ہے۔ لہٰذا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی چمک دمک ماند پڑ جائے گی اور سورج کی طرح یہ بھی ڈھل جائے گا۔ اس لیے اس ناپائیدار شے پر اترانا بے سود ہے۔ اپنے ان خیالات کا شعری اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

؎ چمکے تو ہے سورج کی طرح حسن تمہارا
لیکن یہ سمجھ رکھیو کہ سورج بھی ڈھلے ہے [۴۰]

؎ زلفوں کو دام، آنکھوں کو جادو، لبوں کو پھول
اور آدمی کو چاند کا ٹکڑا نہیں کہا
میں قدر داں ہوں حرمتِ حسن و جمال کا
میں نے کسی کو جانِ تمنا نہیں کہا [۴۱]

اقبال عظیم عشق کو زندگی کا لازمی جزو قرار دیتے ہیں۔ مگر انا کی اہمیت کے بھی دل سے قائل ہیں۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انہیں انا یا عشق میں سے کسی ایک جذبے کی برتری کو تسلیم کرنا پڑے تو یقیناً وہ انا کو ترجیح دیں گے۔ اس لیے کہ انہیں اپنی آن جان سے زیادہ عزیز ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار اس بات کی واضح دلیل ہیں:

؎ مجھے زہر عشق قبول ہے، جو مری وفا کا زیاں نہ ہو
مجھے اپنی آن عزیز ہے، مری جان اتنی اہم نہیں [۴۲]

؎ پاسِ آدابِ وفا، پاسِ انا
عشق میں یہ بھی اہم، وہ بھی اہم [۴۳]

اقبالؔ عظیم بخوبی یہ جانتے ہیں کہ راہِ عشق کے مسافر کو قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ درد، کسک، ٹیس، بے قراری اور مشکلات کو عشق کی سوغات سمجھتے ہیں۔ وہ اس درد کو خاموشی سے برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور بزدل عاشقوں کی طرح رو رو کر اس کا چرچا نہیں کرتے۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کے اسی جذبے کے عکاس ہیں:

؎ آہ و زاری، نہ التجا، نہ گلا
عشق بھی ہم نے با وقار کیا[۴۴]

؎ دردِ دل عشق کی امانت ہے
کوئی قصہ نہیں کہ سب سے کہیں
زخم دل پر لگا تو ہے لیکن
اتنا گہرا نہیں کہ سب سے کہیں[۴۵]

عشاق عموماً عشق میں درپیش تکالیف سے گھبرا کر گریبان چاک کر کے صحراؤں کا رخ کر لیتے ہیں بقول آتشؔ:

؎ ہمیشہ میں نے گریباں کو تار تار کیا
تمام عمر رفو گر رہے رفو کرتے[۴۶]

مگر اقبالؔ عظیم کا انداز اس معاملے میں بھی اوروں سے جدا ہے۔ انہیں اپنے ضبط پر ناز ہے۔ وہ راہِ محبت میں ملنے والے دکھ درد کو خوش دلی سے سہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس عاشق کو عاشق کہلائے جانے کا کوئی حق نہیں جس کے ضبط کا پیمانہ زرا سی بات پر لبریز ہو جائے اور وہ غمِ عشق کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنے گریبان کو تار تار کر دے۔ اپنے درج ذیل اشعار میں وہ سچے عاشق کے اوصاف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ جنوں کی شرطِ اول ضبط ہے، اور ضبط مشکل ہے
جو دامن چاک کر لے اس کو دیوانہ نہیں کہتے[۴۷]

؎سالم ہے اب بھی میرے گریباں کا تار تار
یہ قیس و کوہ کُن کا گریباں تو نہیں[۴۸]

اقبالؔ عظیم تمام عمر غمِ جاناں، غمِ روزگار، غمِ ہجرت، غمِ بے نگاہی اور غمِ بے اعتنائی کے علاوہ بے شمار ان غموں سے نبرد آزما رہے جن کا ذکر باب دوم میں تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور کم حوصلہ شخص ہوتا تو شاید اتنے دکھ نہ جھیل پاتا اور حالات سے گھبرا کر خودکشی کر لیتا یا رب تعالیٰ سے اپنی موت کی التجائیں کرنے لگتا۔ مگر اقبالؔ عظیم نے انتہائی جرات مندی سے ان تمام مسائل و مصائب کا مقابلہ کیا۔ دکھ پر دکھ جھیلنے اور اذیت پر اذیت سہتے رہنے سے وہ رنج سے اس حد تک خوگر ہو گئے کہ انہیں درپیش مشکلات آسانیوں میں بدلتی چلی گئیں۔ غم کی اسی کثرت نے انہیں عزم و ہمت، پندار، ولولہ، ارادوں میں پختگی اور جینے کی امنگ عطا کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے صبر و ضبط کا پیمانہ شاذ ہی لبریز ہوتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ غم کی شدت اور کثرت اکثر انسان کو تڑپا کر رکھ دیتی ہے اور وہ دل برداشتہ ہو کر کسی نہ کسی صورت میں اپنا ردِ عمل ظاہر بھی کر دیتا ہے۔ اقبالؔ عظیم کا متعدد اشعار میں اپنے درد و غم کا اظہار کرنا بھی ایک فطری عمل ہے۔ ورنہ بحیثیت مجموعی ان کی شاعری خودداری کے مضامین سے عبارت ہے۔ اسی جذبے کی بدولت ان میں وہ شانِ بے نیازی پیدا ہوئی جس نے انہیں آہ و بکا سے باز رکھا۔ ان کے نزدیک دکھ درد اور رنج و غم ان کے ذاتی مسائل ہیں۔ لہٰذا زمانے بھر میں ان کی تشہیر ضروری نہیں۔ اس بات کی تائید ان کے درج ذیل اشعار سے بھی ہوتی ہے:

؎ہمیں عادت نہ اب ہے اور نہ تھی فریاد کرنے کی
اگر تھی بھی تو احساسِ انا ہونے سے پہلے تھی[۴۹]

؎زخمِ دل سارے زمانے کو دکھانے سے رہے
آبرو ہم سرِ بازار لٹانے سے رہے
غم ہمارا جو کسی نے نہیں سمجھا، نہ سہی

آہ کرنے سے رہے، اشک بہانے سے رہے[۵۰]

اظہارِ غم کے حوالے سے اقبال عظیم کے ضبط و احتیاط کا عالم یہ ہے کہ وہ اس خدشے کے پیشِ نظر اپنی آنکھوں سے اشک رواں نہیں ہونے دیتے کہ کہیں کوئی آنسو ان کے دل میں نہاں غم کی تشہیر نہ کر دے اور لوگوں کو ان کے حال کی خبر نہ ہو جائے۔ ان کے نزدیک آنسو سامانِ رسوائی کا ایک بہت بڑا سبب ہیں۔ لہٰذا وہ حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ ان کی آنکھوں کے بند مضبوط رہیں اور اُن میں موجود اشکوں کا سیلاب امڈنے نہ پائے۔ اپنے درج ذیل اشعار میں اسی خدشے کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

نہ جانے کون سا آنسو کسی سے کیا کہہ دے
ہم اس خیال سے نظریں جھکائے بیٹھے ہیں[۵۱]

مجھے شکوہ ہے اپنی چشمِ تر سے
گرا جاتا ہوں خود اپنی نظر سے[۵۲]

ایک آنسو بھی بہاتے ہوئے جی ڈرتا ہے
مجھ کو در پردہ کوئی دیکھ رہا ہو جیسے[۵۳]

اقبال عظیم کو اپنے غم بہت عزیز ہیں۔ وہ انہیں اللہ کی رضا سمجھ کر سینے سے لگائے رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک زخمِ دل کی نمائش جرم ہے۔ اسی لیے وہ اپنا غم غیروں پر تو دور کی بات، اپنی سگی اولاد پر بھی ظاہر نہیں کرتے۔ راقم الحروف نے جب ایک ٹیلیفونک انٹرویو میں اقبال عظیم کی صاحب زادی تسکین اقبال عظیم سے استفسار کیا کہ آپ کے والد صاحب کی زندگی میں کون سا غم زیادہ گہرا اور تکلیف دہ تھا؟ تو انہوں نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ: "اس متعلق میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی انتہائی زندہ دلی سے بسر کی اور ہم پر اپنا غم کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔"[۵۴] یہ بات اقبال عظیم کے لیے توہینِ خودداری کے مترادف ہے کہ کوئی انہیں غم زدہ دیکھ کر ان کی غم گساری کی جسارت کرے۔ وہ یہ گوارا نہیں کرتے کہ کوئی ان کے لیے فکر مند ہو اور بے جا ہمدردیوں سے

نوازے۔ اگر کوئی ان کی طبیعت کے بر خلاف ایسا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو ان کا مزاج برہم ہو جاتا ہے اور لہجے میں شدید تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تلخی کی جھلک ان کے درج ذیل اشعار میں بخوبی محسوس کی جا سکتی ہے:

؎ پرسشِ حال کی فرصت تمہیں ممکن ہے نہ ہو
پرسشِ حال طبیعت کو گوارا بھی نہیں[۵۵]

؎ نہایت شکریہ اس پرسشِ احوال کا لیکن
ہمیں عادت نہیں، ہم اپنا افسانہ نہیں کہتے[۵۶]

؎ آپ میری طبیعت سے واقف نہیں، مجھ کو بے جا تکلف کی عادت نہیں
مجھ کو پرسش کی پہلے بھی عادت نہ تھی، اور پرسش کی اب بھی ضرورت نہیں[۵۷]

اقبال عظیم کو زخموں سے چور چور ہونے کے باوجود مرہم کی حاجت نہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ چارہ گروں کو ان کی تکالیف کا علم ہو اور وہ ان کے تدارک کی سعی کریں۔ لہذا وہ حتی المقدور یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے زخموں کو چارہ سازوں سے چھپائے رکھیں یا کوئی ایسا زخم کھائیں جس کا مداوا ان کے لیے ممکن ہی نہ ہو۔ تاکہ انہیں ان کا احسان نہ اٹھانا پڑے۔ اپنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

؎ کچھ ایسے زخم بھی ہم دل پہ کھائے بیٹھے ہیں
جو چارہ سازوں کی زد سے بچائے بیٹھے ہیں[۵۸]

؎ زخمِ دل اپنی جگہ باقی ہے، یہ سچ ہے مگر
زخمِ دل کو حاجتِ مرہم نہیں ہے کم سے کم[۵۹]

؎ وہ زخمِ دل ہے زخمِ نصیبوں کی کائنات

جس زخمِ دل کا کوئی مداوا نہ کر سکے[۶۰]

اقبالؔ عظیم کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے بخوبی یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ غالبؔ کے انانیت پسند مزاج سے نہ صرف بے حد متاثر ہیں بلکہ ان کے مقلد بھی ہیں۔ وہ بھی غالبؔ کی طرح درد سے لذت کشید کرنے میں راحت محسوس کرتے ہیں۔ وہ غالبؔ کے درج ذیل شعر میں بیان ہونے والے خیال سے سو فیصد متفق نظر آتے ہیں:

؎ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا[۶۱]

اقبالؔ عظیم کے نزدیک بھی زخمِ دل کا علاج بے سود ہے۔ اس لیے کہ یہ چارہ سازوں کے بس کی بات ہے ہی نہیں۔ وہ بھی غالبؔ کی طرح اس بات کے قائل ہیں کہ درد جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو آپ اپنی دوا بن جاتا ہے۔ ان کا درج ذیل شعر ان کی اسی فکر کا عکاس ہے:

؎ درد بڑھ کر خود دوا ہو جائے تو ہم کیا کریں
چارہ گر ہم سے خفا ہو جائے تو ہم کیا کریں[۶۲]

اقبالؔ عظیم کو تقریباً تمام عمر، بالخصوص موجودہ بنگلہ دیش سے پاکستان ہجرت کے بعد معاشی تنگ دستی اور بہت سی مالی مشکلات کا سامنا رہا۔ ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد حکومتِ مشرقی پاکستان نے ان کے لیے چار سو تینتیس روپے پچاس پیسے پینشن مقرر کی جسے انہوں نے مغربی پاکستان منتقل کروا لیا۔ ہر حکومت سے اس میں اضافے کی درخواست کی گئی مگر منظور نہ ہوئی۔ فرحت پروین ملک اس ضمن میں لکھتی ہیں:

> اقبالؔ عظیم صاحب انیس سو ستر سے دو ہزار تک چار سو تینتیس روپے پچاس پیسے کی پینشن پر زندہ رہے۔ مغربی پاکستان کی حکومت کا یہ بھی کرم تھا کہ مشرقی پاکستان کے صوبائی ملازمین کی پینشن بحال کر دی۔ اگر وہ یہ بھی نہ کرتے تو اقبالؔ عظیم صاحب اور ان جیسے حضرات ان کا کیا بگاڑ لیتے۔ ایک پالیسی کے تحت ہر سال پینشن میں اضافہ ہوتا رہا۔ مگر تمام تر کوششوں کے باوجود اقبالؔ عظیم صاحب کی پینشن میں ایک پیسے کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔ انہوں نے ہر حکومت کو اپنی رودادِ غم لکھی، مگر شنوائی نہ ہوئی۔[۶۳]

اقبالؔ عظیم نے اس قلیل آمدنی میں انتہائی کسمپرسی کے عالم میں تیس سال گزارے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت اور شادیوں کے انتظامات بھی کیے۔ مگر کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کیا۔ انہیں اپنا دکھ کسی سے بیان کرنے کی عادت نہیں تھی۔ مگر بقول فرحت پروین ملک:

> وہ کبھی مجھ سے اپنے ادبی اور غیر ادبی دکھ کا ذکر ہلکے سے کر جاتے تھے۔ مشرقی پاکستان سے آنے کے بعد اپنے حالات کی تصویر ایک جملے میں کھینچ کر رکھ دی۔ آج کل ہمارے گھر میں رسوئی چل رہی ہے۔[۶۴]

معاشی تنگ دستی میں عموماً انسان کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے اور وہ اپنا اور اپنے اہلِ خانہ کا پیٹ پالنے کے لیے کسی بھی حد سے گزرنے سے گریز نہیں کرتا۔ وہ حلال و حرام کی تمیز کیے بغیر کسی بھی ناجائز ذریعے سے آمدنی کے حصول کو یقینی بناتا ہے تاکہ اس کی اور اس کے زیرِ کفالت افرادِ خانہ کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں۔ مگر اقبالؔ عظیم کو اللہ پر کامل بھروسا ہے۔ وہ کبھی رحمتِ خداوندی سے مایوس نہیں ہوتے اور نہ ہی غمِ دوراں سے گھبراتے ہیں:

؎ یوں ڈراتا ہے زمانہ غمِ دوراں سے مجھے
میرے حق میں غمِ دوراں بھی خدا ہو جیسے[۶۵]

اقبالؔ عظیم کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے کسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں یا التجا کریں۔ انہیں تنگ دستی میں زندگی بسر کرنا منظور ہے۔ مگر دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا نہیں۔ انہیں امدادِ غیبی کے سوا کسی کی مدد کی طلب نہیں۔ وہ اپنے احباب کی وفا شعاری پر نازاں تو ہیں، مگر ان کے شرمندہ احسان نہیں ہونا چاہتے۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کے اسی جذبہ خودداری کے عکاس ہیں:

؎ ہاتھ پھیلاؤں میں عیسیٰ نفسوں کے آگے
درد پہلو میں مرے ہے، مگر اتنا بھی نہیں[۶۶]

؎ ان کو خود آ جائے تو اقبالؔ آ جائے خیال
کم سے کم میری زباں سے التجا ممکن نہیں[۶۷]

؎ احساسِ حمیت اہلِ نصب کی سب سے بڑی کمزوری ہے
وہ اپنوں سے بھی حالِ پریشاں کہتے ہوئے شرماتے ہیں[۶۸]

اقبال عظیم ایک درویش منش انسان ہیں۔ انہیں اہلِ ثروت کی دولت اور لطف و کرم کی کوئی حاجت نہیں۔ امراء لاکھ چاہیں کہ ان سے کرم کی بھیک مانگی جائے، مگر اقبال عظیم کے لیے یہ نہ ممکن ہے۔ وہ فقر کو اپنا فخر سمجھتے ہیں اور فقیری کو بادشاہی پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں بادشاہوں کو اپنی مغروری، ظلم و بربریت، بے حسی اور ریاعا کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھنے کی بنا پر ملامت اور بد دعاؤں کا سامنا رہتا ہے۔ مظلوم عوام کی آہیں سیدھی عرش پر جاتی ہیں اور جلد یا بدیر حکمرانوں کو اللہ کی ناراضی اور غضب کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ لہذا اقبال عظیم اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ انہیں بادشاہی نہیں، بلکہ گدائی نصیب ہو تاکہ انہیں ظالموں کی صف میں شامل نہ ہونا پڑے۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کے اسی درویشانہ بانکپن کے ترجمان ہیں:

؎ مشکل کُشا مصر ہے کہ ہم التجا کریں
اور التجا گدائی ہے، مشکل یہی تو ہے[۶۹]

؎ بد دعائیں نہ سن سکوں گا میں
مجھ کو شاہی نہ دے، گدائی دے[۷۰]

؎ ہم ماتھے پہ بل ڈال کے بازار سے گزرے
ہم جیسے فقیروں کو کوئی دے بھی تو کیا دے[۷۱]

؎ مجھے اپنے فقر پہ ناز ہے، مجھے اس کرم کی طلب نہیں
میں گدا نہیں ہوں فقیر ہوں، یہ کرم گداؤں میں بانٹ دو[۷۲]

اقبال عظیم تقریباً پچاس سال کی عمر میں بینائی جیسی عظیم نعمت سے محروم ہو گئے تھے۔ ان دنوں وہ مشرقی پاکستان میں تدریسی اور علمی و ادبی خدمات سر انجام دے رہے تھے۔ بصارت کھو جانے سے ملازمت میں پیچیدگیاں بڑھنے لگیں تو انہوں نے قبل از وقت استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ وہ اپنے بچوں کے واحد کفیل تھے اور اہلیہ کے انتقال کے بعد ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بھی تن تنہا نبھا رہے تھے۔ اسی محرومی کے ساتھ انہوں نے مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان ہجرت کی۔ سفر کی صعوبتیں اور خانہ بدوشی کی تلخیاں بھی برداشت کیں۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اس معذوری کو مجبوری نہیں بننے دیا۔ بلکہ معذوریِ چشم کو اپنی کمزوری نہیں، بلکہ طاقت بنایا اور جواں مردی سے حالات کا مقابلہ کیا۔ انہوں نے نابینا ہونے کے باوجود باوقار زندگی بسر کی اور آنکھ والوں کے لیے ایک مثال قائم کی۔ بقول ناصر حیات:

> اقبال عظیم اپنے قاری اور سامع کو ضمیر فروشی، منافقت، گدایانہ رویہ حیات، معذرت خواہانہ حقوق طلبی اور بزدلانہ آہ وزاری سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اور اپنی بینائی کے زیاں کے حوالے سے معذوری کے باوجود دلیرانہ زندگی بسر کرنے کا قرینہ بھی فراہم کرتے ہیں۔[۴۳]

اقبال عظیم کو اس لیے روشنی کے چھن جانے کا افسوس نہیں ہے کہ ان کی چشمِ بصیرت روشن تر ہے۔ لہذا یہ اندھیرے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ انہیں ظلمات سے ڈر نہیں لگتا۔ وہ اچھی طرح اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ باطن کی آنکھ روشن ہو تو تاریکیاں انسان کو آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتیں۔ اپنے درج ذیل اشعار میں وہ اندھیروں کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ روشنی مجھ سے گریزاں ہے تو شکوہ بھی نہیں
میرے غم خانے میں کچھ ایسا اندھیرا بھی نہیں[۴۴]

چھین لیں مجھ سے روشنی میری
ان اندھیروں کی یہ مجال کہاں[۴۵]

اقبال عظیم معذوری کے معاملے میں بھی خوددار واقع ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بصارت سے محروم فرد اپنے بہت سے کام خود نہیں کر سکتا اور اسے ان کی تکمیل کے لیے دوسروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یقیناً اقبال عظیم کو بھی کسی نہ کسی کی مدد درکار ہوتی ہو گی۔ مگر وہ حتی المقدور یہ کوشش کرتے ہیں کہ انہیں کسی پر انحصار نہ کرنا پڑے۔ وہ نہ دیکھ سکنے کے باعث ٹھوکر کھا کر گر بھی پڑیں تو کسی کو مدد کے لیے نہیں پکارتے کہ کہیں ان کی انا مجروح نہ ہو جائے۔ انہیں کسی بھی حال میں دوسروں سے اپنی بے کسی کا ذکر کرنا پسند نہیں۔ پاشا رحمٰن اس ضمن میں رقم طراز ہیں: "اقبال عظیم کی غزلوں سے ان کی شخصیت کا ایک پہلو جو بہت ابھر کر سامنے آتا ہے، وہ ان کا عزتِ نفس کا پاس ہے۔"[۷۶] پاشا رحمان کے ان الفاظ کی تائید اقبال عظیم کے درج ذیل اشعار سے بھی ہوتی ہے:

؎ خدا محفوظ رکھے اس گھڑی سے میری غیرت کو
کہ دشمن بھی ترس کھا کر مرا غم خوار ہو جائے[۷۷]

؎ میں پوچھتا ہوں کہ یہ تیرگی بری کیا ہے
جو مل بھی جائے تو مانگے کی روشنی کیا ہے
میں زندگی کو سہاروں پہ چھوڑ دوں کیسے؟
میں جانتا ہوں مالِ سپردگی کیا ہے[۷۸]

؎ ہم ٹھوکر کھا کے جب بھی گرے، راہ گیروں کو آواز نہ دی
وہ آنکھوں کی معذوری تھی، یہ غیرت کی مجبوری تھی[۷۹]

اقبال عظیم کے والد محکمہ پولیس میں انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ بسلسلہ ملازمت ان کا تبادلہ مختلف شہروں میں ہوتا رہا۔ لہٰذا اقبال عظیم کو بھی اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ہم راہ کچھ عرصے بعد کسی اور شہر یا قصبے کا سفر اختیار کرنا پڑتا۔ بعد ازاں جب وہ خود ملازم ہو گئے تو بھی انہیں چار و ناچار سفر در سفر کی اذیت سے گزرنا پڑا۔ آخر غریب الوطنی اس طرح ان کا مقدر بن گئی کہ تاحیات دم قدم کے ساتھ رہی۔ انہیں ہندوستان سے مشرقی پاکستان اور مشرقی پاکستان سے

مغربی پاکستان ہجرت کرنا پڑی۔ ان ہجرتوں کے دوران بھی انہیں سفر کی صعوبتیں اور خانہ بدوشی کی تلخیاں جھیلنا پڑیں۔ یقیناً ان حالات میں پر عزم اور ثابت قدم رہنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ خود اقبال عظیم کے لیے بھی یہ تمام تر صورت حال انتہائی تکلیف دہ تھی۔ اس تکلیف کی شدت ان کے درج ذیل شعر میں بخوبی محسوس کی جاسکتی ہے:

؎ تم تو آرام سے بیٹھے ہو، تمہیں کیا معلوم
شوقِ تعمیر میں کچھ لوگوں کا گھر جاتا ہے[۸۰]

حالات کا مقابلہ کرتے رہنے سے اقبال عظیم میں عزم وہمت، جرات مندی اور زندگی جینے کا ایک نیا ولولہ پیدا ہو گیا۔ وہ حوادثِ زمانہ کو خاطر میں نہیں لاتے۔ قدم قدم پر راہ میں حائل رکاوٹیں اور راستے کی مشکلات ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ جب ایک فرد سفر کا ارادہ باندھ لیتا ہے تو دشواریاں اس کا مقدر بن جاتی ہیں اور ان گنت طوفان اس کے منتظر ہوتے ہیں۔ لہٰذا عازمِ سفر کو اس صورت حال کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے اور فراخ حوصلگی کے ساتھ حوادث زمانہ کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی اسی پر عزم فکر کے عکاس ہیں:

؎ سفر پہ نکلے ہیں ہم پورے اہتمام کے ساتھ
ہم اپنے گھر سے کفن ساتھ لے کے آئے ہیں[۸۱]

؎ جیسے جیسے حادثے دادِ سفر دیتے رہے
ویسے ویسے اور محکم جستجو ہوتی رہی[۸۲]

؎ جو شوقِ سفر ہے تو کئی دکھ بھی سہو گے
پھر سوچ لو تم گھر میں رہو گے، کہ چلو گے[۸۳]

اقبال عظیم کے عزم وہمت اور حوصلہ مندی کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ انہیں معذوریِ چشم کے باوجود کٹھن اور پر پیچ راہوں پر چلنے کا شوق ہے۔ انہیں زندگی میں ٹھہراؤ پسند نہیں۔ وہ ہمہ وقت سرگرمِ سفر رہنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ زندگی اور اس کی تمام رعنائیاں جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم ہی سے عبارت ہیں۔ لہٰذا انسان

کو خوب سے خوب تر کی تلاش میں آگے بڑھتے رہنا چاہیے۔ درج ذیل اشعار میں وہ اپنے اسی عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ لطف تو اقبالؔ ان راہوں میں ہے
ہر قدم پر جن میں ہوں کچھ پیچ و خم[۸۴]

؎ ہم سفر میں ہیں فقط پر پیچ راہوں کے لیے
حادثے معلوم ہیں ہم کج کلاہوں کے لیے[۸۵]

؎ زندگی نام ہے مصروفِ سفر رہنے کا
اس مسافت میں کہاں مہلتِ آرام ابھی[۸۶]

اقبالؔ عظیم نے اپنی آنکھوں سے مسلمانانِ برِ صغیر کو حصول آزادی کے لیے جدوجہد کرتے اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے دیکھا تھا۔ وہ ہندوستان کے طول و ارض میں برپا ہونے والے خوں ریز انسانیت سوز فسادات و مناقشات کے بھی عینی شاہد تھے۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد مشرقی پاکستان کے عوام کے دلوں میں انہوں نے غیر بنگالیوں کے لیے نفرت بھی محسوس کی، ان کے طعنے اور شکوے بھی سنے اور ان کی قہر آلود نظروں کا سامنا بھی کیا۔ اس تمام صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

؎ اب وہ احباب، نہ ماحول، نہ آداب، نہ پرسش، نہ سلام
اب تو محفل میں کوئی اپنا شناسا ہی نہیں ہے شاید[۸۷]

اقبالؔ عظیم مشرقی پاکستان میں تن دہی سے تدریسی و تحقیقی اور علمی و ادبی خدمات کی انجام دہی کے باوجود اجنبیت و عدم شناخت کا شکار رہے اور مہاجر کہلائے۔ گو اقبالؔ عظیم جیسے حساس شاعر کے لیے یہ صورت حال بے حد تکلیف دہ تھی۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے نہ صرف مذکورہ بالا حالات کا جرات مندی سے مقابلہ کیا، بلکہ اہلِ مشرقی پاکستان کو یہ باور بھی کرایا کہ غیر بنگالیوں سے ان کا ناروا سلوک مناسب نہیں ہے۔ اس لیے کہ غیر بنگالی مسلمانوں نے بھی

حصولِ آزادی کی خاطر اتنی ہی قربانیاں دی ہیں جتنی بنگالیوں نے۔ پاکستان کے اس خطہ زمین پر غیر بنگالیوں کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا بنگالیوں کا۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی اسی سوچ کے غماز ہیں:

؎ جب بھی ملیے، وہی تلخی، وہی شکوے، وہی ماتھے پہ شکن
آپ سے کوئی ملے، آپ کا منشا ہی نہیں ہے شاید[88]

؎ ہماری خانہ خرابی کو دائمی نہ سمجھ
قسم خدا کی، کبھی کی ہے خسروی ہم نے[89]

اقبال عظیم نے مشرقی پاکستان کے حالات دگرگوں ہونے کے بعد اپنے ہی مسلمان ہم وطنوں کو ایک دوسرے کے خون سے ہاتھ رنگتے اور انسانی اقدار کو پامال ہوتے دیکھا، دوسری بار اپنی مرضی کے برخلاف ہجرت پر مجبور ہوئے اور بدقسمتی سے مغربی پاکستان میں بھی مہاجر ہی کہلائے۔ انہوں نے سیاسی رہنماؤں کی ملک دشمن پالیسیوں کی بنا پر وطنِ عزیز کو دولخت ہوتے دیکھا اور مارشل لاء کے ادوار میں ہونے والی سختیاں بھی برداشت کیں۔

اس تمام تر صورتِ حال میں بھی، جبکہ حکمرانوں پر تنقید یا ان کی ملک دشمن پالیسیوں کی مذمت کا انجام صاف ظاہر تھا اقبال عظیم خاموش نہیں رہے:

؎ حاکمِ وقت پہ تنقید کا اقبال نتیجہ معلوم
اور وہ یہ کہ تمہیں شہر میں رہنا ہی نہیں ہے شاید[90]

اقبال عظیم نے انجام سے بے خبر ہو کر برسرِ اقتدار ہر حکمران اور اس کے حواریوں کے غیر آئینی، غیر اخلاقی اور منفی اقدام کے خلاف کھل کر صدائے احتجاج بلند کی۔ مثلاً:

؎ اہلِ تقیٰ کا حال بھی معلوم ہے مجھے
میں نے انہیں بھی کعبہ و قبلہ نہیں کہا
حتیٰ کہ شیخِ وقت کو دعووں کے باوجود
مشکل کشائے ملتِ بیضا نہیں کہا[91]

اقبال عظیم حکام وقت کی طاقت اور اقتدار سے مرعوب نہیں ہوتے۔ ان کے نزدیک یہ سب عارضی ہے اور ایک دن ختم ہو جائے گا۔ وہ اپنی قوم کو اس حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں کہ ان ناخداؤں پر بھروسہ کرنا سراسر نادانی ہے۔ اس لیے کہ وہ کبھی بھی کشتی ڈبو سکتے ہیں اور اس اقدام سے ان کی اپنی جان بھی جا سکتی ہے۔ وہ تو خود اللہ کی رحمت اور مدد کے محتاج ہیں اور خود اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے تو پھر انکے سہارے سفینہ قوم کیسے پار لگ سکتا ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کے انہیں خیالات کے عکاس ہیں:

؎ یہ کون بے حس و حرکت پڑا ہے ساحل پر
چلو قریب سے دیکھیں، یہ نا خدا ہی نہ ہو[92]

؎ نصیب کیسے بدل دے کوئی سفینے کا
جو نا خدا ہے وہ سب کچھ سہی، خدا تو نہیں[93]

؎ یہ جھوٹے خدا مل کے ڈبو دیں گے سفینہ
تم ہادیٔ برحق کو صدا کیوں نہیں دیتے[94]

؎ آواز نا خدا کو نہیں، اب خدا کو دو
ہے آخری نشان پہ دریا چڑھا ہوا[95]

اقبال عظیم ایک عوامی شاعر ہیں۔ حبِ انسانیت ان کی شخصیت کا انتہائی اہم وصف ہے۔ وہ بادشاہ کا فرمان تو ٹال سکتے ہیں، مگر کسی دوست کی پر خلوص دعوت نہیں ٹھکرا سکتے۔ انہیں دربار سے وابستگی پسند نہیں۔ نہ ہی وہ وہاں کے آداب سے واقف ہیں۔ انہیں تعظیماً بھی حاکم وقت کے آگے سر جھکانا گوارا نہیں۔ انہیں قصرِ شاہی کی نسبت اپنے گھر آنگن کے در و دیوار زیادہ عزیز ہیں۔ اپنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

؎ ہمیں دربارِ شاہی میں نہ لے چلتے تو اچھا تھا

ہمارا کچھ نہ جائے گا، تمہیں شرمندگی ہو گی[۹۶]

جو مجھ سے ملنا ہے تو دوستوں کی سطح پر ملیے
نہ درباری ہوں میں کوئی، نہ حضرت کا مصاحب ہوں[۹۷]

اک دوست نے بلایا ہے، ہم کیسے ٹال دیں
یہ کوئی قصرِ شاہی کا فرمان تو نہیں[۹۸]

شوکت و شانِ محلات بھی تسلیم ہمیں
اپنے گھر کے در و دیوار مگر کیا کہنا[۹۹]

اقبال عظیم نے ہجرت کے بعد پاکستان میں انتہائی کسمپرسی کے عالم میں وقت گزارا مگر کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کیا۔ انہوں نے جاہ و منصب کے حصول کے لیے نہ کسی وزیر کی خوشامد کی اور نہ حاکمِ وقت کا قصیدہ لکھا۔ انہوں نے چند روپوں کے عوض اپنا فن نہیں بیچا اور نہ ہی کسی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کسی خاص تناظر میں شعر کہے۔ بلکہ انہوں نے جو دیکھا، سنا، سمجھا اور محسوس کیا اسے شعر کے کالب میں ڈھال کر بیان کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار کی سادگی، سچائی، خلوص اور تاثیر آج بھی پڑھنے والوں کو اپنے سحر میں گرفتار کر دیتی ہے۔ اقبال عظیم کے درج ذیل اشعار ان کے انہیں خیالات کا پرتو ہیں:

میں غزل گو ہوں، قصیدہ تو نہیں کہ سکتا
کیا کروں، لہجہ دربار کہاں سے لاؤں[۱۰۰]

فکر و اظہار میں ہم حکم کے پابند نہیں
شاعری حسبِ ہدایت نہیں ہو گی ہم سے[۱۰۱]

غلط سمجھے ہیں مجھ کو اہلِ ثروت
سخن ور ہوں، میں سوداگر نہیں ہوں
قصیدے میں نہیں پڑھتا کسی کے
غزل گو ہوں، میں پیشہ ور نہیں ہوں[۱۰۲]

اقبال عظیم کی شاعری کا دوسرا اہم وصف رجائیت ہے۔ وہ کسی بھی حال میں امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ وہ اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ انہیں اپنے پروردگار پر پورا بھروسہ ہے۔ ان کے رب نے بھی ہمیشہ ان کے بھروسے کی لاج رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی میں آنے والی ہر آزمائش پر ثابت قدم رہے اور تمام مشکلات کا انتہائی جرات مندی سے مقابلہ کرتے رہے۔

اقبال عظیم ایک بہترین غزل گو شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں تغزل اپنے پورے حسن اور رعنائی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک پر گو اور خوش فکر شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کو فنی و فکری دونوں اعتبار سے با آسانی اردو ادب کی بہترین غزلوں کے انتخاب میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ لیکن افسوس کہ بد قسمتی سے انہیں غزل گو شاعر کی حیثیت سے وہ مقام و مرتبہ حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ حق دار تھے۔ ہارون رشید اپنے ایک مضمون "پروفیسر اقبال عظیم: عظیم شاعر، عظیم انسان" میں لکھتے ہیں:

> وہ ۱۹۷۰ء میں کراچی آ گئے۔ خوش قسمت تھے کہ سقوطِ ڈھاکہ کی آفتوں کا انہیں سامنا نہ کرنا پڑا۔ کراچی میں انہوں نے تقریباً تیس سال گوشہ نشینی کی زندگی گزاری۔ کبھی کبھی مشاعروں میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن ان کی وہاں وہ پزیرائی نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔[۱۰۳]

میر و غالب اور اکثر بڑے شعرا کی طرح اقبال عظیم کو بھی زمانے کی ناقدری اور بے اعتنائی کا سامنا رہا۔ بلا شبہ بحیثیت نعت گو شاعر انہیں بے پناہ شہرت حاصل ہوئی مگر غزل گو کی حیثیت سے ان کی اہمیت کو اس طرح تسلیم نہیں کیا گیا، جس طرح کیا جانا چاہیے تھا۔ فرحت پروین ملک اس حوالے سے اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

ادبی گروپ بندی کی دھند نے کچھ اچھے شاعر ادیب کا کام عام قاری کی نظر سے اوجھل کر دیا۔ اس دھند کی لپیٹ میں اقبال عظیم صاحب بھی آ گئے۔ اردو شاعری پر سچائی اور غیر جانب داری سے کام کرنے والوں کو اقبال عظیم اور ان جیسے فراموش کردہ شاعر ضرور یاد آئیں گے۔[۱۰۴]

تعجب کی بات یہ ہے کہ اقبال عظیم اس ناقدری پر بھی رنجیدہ و افسردہ نہیں ہوتے۔ انہیں یقین کامل ہے کہ آج جو لوگ انہیں فراموش کیے بیٹھے ہیں، کل انہیں کی زبانوں پر ان کی غزلیں ہوں گی۔ جب جب لکھنؤ، ڈھاکہ اور کراچی کے غزل گو شعرا کی تاریخ رقم کی جائے گی، اس میں ان کی خدمات کا اعتراف بھی کیا جائے گا۔ آئندہ نسل کے طالبِ علم ان کے فن اور شخصیت پر اپنے تحقیقی مقالے تحریر کریں گے اور محفلوں میں ان کی شاعری، بہادری اور جواں مردی کی مثالیں دی جائیں گی۔ لہٰذا زمانے کو چاہیے کہ ان کی قدر کرے اور ان کی اہمیت ہر اعتبار سے تسلیم کرے۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کے عزم و ہمت اور رجائی فکر کے ترجمان ہیں:

؎ جب بھی اس شہر کی تاریخ لکھی جائے گی
تذکرہ ہو گا ہمارا بھی حوالوں کی طرح
آج کے بچے یہ سن لیں، کہ ہماری روداد
کل لکھی جائے گی تحقیقی مقالوں کی طرح
ان کا کہنا بھی یہی ہے، جو خفا ہیں ہم سے
ہم سنے جاتے ہیں محفل میں مثالوں کی طرح
ہم ہیں اِک زندہ حقیقت، ہمیں تسلیم کرو
ہم ہیں خوابوں کی طرح، اور نہ خیالوں کی طرح[۱۰۵]

وقت نے ان کی ہر پیشن گوئی کو سچ اور درست ثابت کیا۔ آج ان پر تحقیقی مقالہ جات بھی لکھے جا رہے ہیں اور ان کی شاعرانہ اہمیت اور ادبی خدمات کا اعتراف بھی کیا جا رہا ہے۔

پاکستان ہجرت کرنے کے بعد اقبال عظیم کو بہت سی مالی مشکلات کا سامنا رہا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی ساری زندگی شانِ بے نیازی سے بسر کی۔ انہوں نے اللہ کے سوا کسی کو مدد کے لیے نہیں پکارا اور نہ ہی کبھی شہرت کے

تعاقب کیا۔ انہوں نے دشمن تو در کنار، دوستوں کا احسان بھی گوارا نہیں کیا۔ انہیں رب العزت نے اپنی رحمت سے شہرت اور ناموری عطا کی۔ وہ بہت جلد اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر عوام میں مقبول ہو گئے۔ بقول فرحت پروین ملک:

> رائٹر گلڈز والوں کو اقبال عظیم اور ان جیسے حضرات کے پرسشِ احوال کی فہرست نہیں ملی۔ یہ الگ بات ہے کہ خدا کی رحمت اور ذاتی صلاحیت کے بل بوتے پر زندگی کو قابلِ برداشت بنالیا۔ نوجوانوں کے لیے دنیا بہت بڑی تھی اور ان میں قوتِ پرواز بھی تھی۔ مگر اقبال عظیم صاحب اور ان جیسے اہلِ علم و ادب کی دنیا بہت محدود تھی۔ ستانے کی عمر میں وہ اپنے لیے نیا امریکہ تلاش نہیں کر سکتے تھے۔[۱۰۶]

اقبال عظیم اہلِ ثروت کی مالی اعانت نہ کرنے اور ادبا کے نظر انداز کرنے پر نالاں نہیں ہیں۔ بلکہ اس بات پر نازاں ہیں کہ انہوں نے رب العزت کی عطائے خاص سے زندگی میں بہت کچھ حاصل کیا۔ غزل گوئی کی بدولت نہ سہی، نعت گوئی کے وسیلے سے انہیں جو شہرت نصیب ہوئی وہ بہت کم شعرا کے حصے میں آتی ہے۔ انہیں خوشی ہے کہ انہیں زندگی میں جو بھی ملا جتنا ملا، اللہ کے فضل اور اپنی محنت، لگن اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے سے ملا ہے۔ انہوں نے کسی بھی کام کی انجام دہی کے لیے کسی کا سہارا نہیں لیا۔ اپنے درج ذیل اشعار میں اسی بات پر فخر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

میں مستند نہ کسی اور کی سند سے ہوا
میں سر بلند ہوا تو خود اپنے قد سے ہوا
کسی عطا، نہ کسی اور کی مدد سے ہوا
مرا جو کام ہوا، رحمتِ احد سے ہوا[۱۰۷]

اقبال عظیم اپنے قاری کو پر امید رہنے اور اللہ پر کامل بھروسہ رکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ اسے یہ بھی باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ رزق برحق ہے اور ہر ذی روح کو اس کے حصے کا رزق مل کر رہتا ہے۔ لہٰذا اسے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ دوسروں کے سامنے سر جھکانے اور دستِ سوال دراز کرنے کی بجائے اسی سے ہر شے طلب کرنی چاہیے جو رازق حقیقی ہے۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کو کفرانِ نعمت سے باز رہنے کی بھی تلقین کرتے ہیں اور اسے یہ سمجھانے کی کوشش

کرتے ہیں کہ اللہ ناشکری کرنے پر اپنی ہی عطا کردہ نعمتیں چھین لینے پر بھی قادر ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار توکل علی اللہ اور کفران نعمت سے باز رہنے کا درس دیتے ہیں:

؎ وہ جو رزاق حقیقی ہے، اسی سے مانگو
رزق بر حق ہے، کہیں اور صدا مت دینا[108]

؎ جھک گیا سر اگر کسی در پر
رہ گئی حرمتِ توکل کیا؟[109]

؎ اللہ کی عطاؤں پہ کفران مت کرو
فی الفور چھن بھی سکتا ہے سب کچھ دیا ہوا[110]

اقبال عظیم میں رنج و آلام سے نبرد آزما رہنے کا جذبہ بھی ہے اور انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کا حوصلہ بھی۔ بات بے بات رونا دھونا، آہ وزاری اور شکوہ وشکایت ان کے مزاج کے خلاف ہے۔ محی الدین عزم اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> اقبال عظیم صاحب رجائیت پسند شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں حزن تو ہے، لیکن حزن آفرینی نہیں ہے۔ وہ زندگی کے بارے میں ایک بہت مثبت اور حقیقت پسندانہ نقطہ نظر رکھتے ہیں اور اپنی شاعری میں بھی اسی نقطہ نظر کے ترجمان ہیں۔[111]

اقبال عظیم عالمِ غم میں بھی مایوس ہونا نہیں جانتے۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ زندگی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں اور اسی اتار چڑھاؤ کی بدولت اس میں حرکت، حرارت، دل کشی اور رعنائی ہے۔ وہ اس امید پہ زندگی کی تمام تلخیوں کو ہنس کر پی جاتے ہیں کہ وقت کتنا ہی کڑا اور تکلیف دہ ہو، آخر گزر جاتا ہے اور جس طرح انسانی زندگی میں خوشیاں عارضی ہیں بالکل اسی طرح غم بھی دائمی نہیں ہیں۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی اسی پر امید فکر کے عکاس ہیں:

؎ شکوہ مرا مزاج، نہ ماتم مری سرشت
ہرچند مجھ سے خندہ لبی چھین لی گئی[112]

؎ خوشی سے چوٹ کھا لیتے ہیں، نم دیدہ نہیں ہوتے
جو اہلِ دل ہیں آسانی سے رنجیدہ نہیں ہوتے[۱۱۳]

؎ وہ خوشی بھی کوئی خوشی ہوئی، جو رہینِ دستِ سوال ہو
یہ تو زندگی کا مزاج ہے، مجھے غم کا کوئی بھی غم نہیں[۱۱۴]

؎ میں یہی سوچ کے ہر رنج سہے جاتا ہوں
وقت جیسا بھی ہو، آخر کو گزر جاتا ہے[۱۱۵]

اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بے شمار نعمتوں میں سے انسان کسی ایک بھی نعمت سے محروم ہو یا اس سے یہ نعمت چھین لی جائے تو اس کے لیے زندگی بسر کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ اقبال عظیم کو بھی معذوریِ چشم کے باعث یقیناً بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔ پچاس برس کی عمر میں نابینا ہونے کا صدمہ جھیلنا آسان نہیں رہا ہو گا۔ اس سانحے پر دکھ کا اظہار عین فطری ہے۔ محرومی کے اس احساس نے انہیں جو درد اور ٹیس عطا کی ہے اس کی کسک ان کے بہت سے اشعار میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ لیکن اقبال عظیم کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر حال میں راضی برضا رہتے ہیں۔ انہیں بینائی چھن جانے پر بھی مایوسی نہیں ہے۔ وہ اس عالم میں بھی شکر گزاری کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انہیں اپنے ہم نفسوں کی صورتیں نہ دیکھ سکنے کا اس لیے کوئی رنج نہیں ہے کہ وہ آوازوں سے ان کا تصوراتی پیکر تراش لیتے ہیں۔ وہ بے بصری کو اپنی کمزوری نہیں بننے دیتے اور اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے کسی بھی منزل کے تعاقب میں عزم سفر باندھ لیتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی بصارت سے محرومی ان کے مضبوط اور تیز رفتار قدموں کو نہ ڈگمگا سکتی ہے اور نہ ہی سست یا شل کر سکتی ہے۔ وہ ظلمت سے روشنی کشید کرنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔ انہوں نے عملاً ثابت بھی کر کے دکھایا کہ ان کی آنکھیں ضرور معذور ہیں، مگر وہ خود معذور نہیں اور کسی بھی طرح معاشرے کے عام افراد سے کم نہیں ہیں۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی اسی امید افزا سوچ کے عکاس ہیں:

؎ تصور خود بنا لیتا ہے آوازوں سے تصویریں

مری محفل میں نا دیدہ بھی نا دیدہ نہیں ہوتے[۱۱۶]

؎قدم اٹھے ہیں تو منزل بھی مل ہی جائے گی
میں بے بصر سہی لیکن، شکستہ پا تو نہیں[۱۱۷]

؎مری آنکھ بجھ بھی گئی تو کیا، مری روشنی مرے ساتھ ہے
ابھی میرا چاند چھپا نہیں، مرے گھر میں شامِ الم نہیں[۱۱۸]
؎آنکھ معذور سہی، ہم ابھی معذور نہیں
زندگی کرتے ہیں ہم آنکھ ہی والوں کی طرح[۱۱۹]

اقبالؔ عظیم زندگی میں مثبت رویوں کی اہمیت کے قائل ہیں۔ وہ زندگی میں پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے مسائل کو خاطر میں نہیں لاتے بلکہ انہیں مسائل سمجھتے ہی نہیں۔ وہ مشکلات سے دل برداشتہ نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنے سینے میں زندہ رہنے کی رمق ہمیشہ باقی رکھتے ہیں اور جینے کی یہی رمق انہیں چلچلاتی دھوپ میں بھی سرگرمِ سفر رکھتی ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی اسی زندہ دلی کا پرتو ہیں:

؎ یوں بظاہر زندگی سے مطمئن کوئی نہیں
آرزو جینے کی پھر بھی کم نہیں ہے کم سے کم[۱۲۰]

؎سفر میں عمر کٹی اور دھوپ میں بھی چلے
مگر نہ پیر ہمارے تھکے، نہ پاؤں جلے[۱۲۱]

؎میں تو سمجھا تھا کہ لے ڈوبیں گے حالات مجھے
شکر ہے زندہ دلی اپنی جگہ باقی ہے[۱۲۲]

ہم نے خود پیدا کیے ہیں زندگی میں مسئلے
ورنہ سچی بات یہ ہے، مسئلہ کوئی نہیں[۱۲۳]

اقبالؔ عظیم حوادثِ زمانہ اور سفر کی صعوبتوں سے نہیں گھبراتے۔ مشکل سے مشکل حالات میں بھی وہ ناامید نہیں ہوتے۔ انہیں یقین رہتا ہے کہ ان کا رب انہیں ضرور ان کی منزل پر پہنچادے گا اور وہ کبھی ناکام و نامراد نہیں ہوں گے۔ ان کے خیال میں اگر انسان کا بھروسہ قادرِ مطلق پر ہو، ارادوں میں پختگی ہو اور حوصلہ جوان ہو تو تلاطم خیز موجیں اور طوفان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ سفر کے لیے جنون، عزمِ راسخ اور مستقل مزاجی کو لازمی سمجھتے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ ٹھوکریں کھا کر گرتے نہیں، بلکہ مزید سنبھل جاتے ہیں:

اک قدم اور پندارِ یقینِ محکم
رخ بدل سکتا ہے بڑھتے ہوئے طوفانوں کا[۱۲۴]

دیوانے جب اٹھے تو فضائیں بدل گئیں
صد ہا چراغ راہ میں جلتے چلے گئے
طوفان آئے، حشر اٹھے، آندھیاں چلیں
لیکن قدم کچھ اور سنبھلتے چلے گئے[۱۲۵]

ہم کو منزل شناسی پہ بھی ناز ہے، اور ہم آشنائے حوادث بھی ہیں
جوئے خوں سے گزرنا پڑے بھی تو کیا، جستجو کو تو اِک راستہ چاہیے[۱۲۶]

اقبالؔ عظیم اپنے قاری کو بھی زندگی میں مسلسل آگے بڑھنے اور سرگرمِ سفر رہنے کا درس دیتے ہیں۔ وہ بھی علامہ اقبالؒ کی طرح عظمتِ انسانی کے دل سے قائل ہیں اور اپنے ہم نفسوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی بہترین مخلوق ہیں۔ انہیں کسی بھی سفر پر روانگی کے لیے کسی ہم سفر یا رہنما کی نہیں، بلکہ عزمِ راسخ کی ضرورت ہے۔ وہ چاہیں تو آپ

اپنی رہبری کا فریضہ سرانجام دے سکتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ امید کا دامن تھامے رکھیں اور کبھی ہمت نہ ہاریں۔ راستے میں آنے والی رکاوٹوں کی مطلق پرواہ نہ کریں اور ٹھوکروں سے خائف نہ ہوں۔ اس لیے کہ یہی ٹھوکریں آگے چل کر انسان کو زندگی جینے کا حوصلہ عطا کرتی اور سنبھالا دیتی ہیں۔ اپنے درج ذیل شعر میں وہ کہتے ہیں:

ہم سفر ڈھونڈو، نہ رہبر کا سہارا چاہو
ٹھوکریں کھاؤ گے تو خود ہی سنبھل جاؤ گے[۱۲۷]

اقبالؔ عظیم کو تقریباً اپنی ساری زندگی غریب الوطنی کے عالم میں بسر کرنا پڑی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان سے مشرقی پاکستان اور پھر مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان ہجرت کی اذیت سے دوچار ہونا پڑا۔ ان دونوں ہجرتوں کے دوران انہیں بہت سے دکھ اور ناقابلِ تلافی نقصانات اٹھانا پڑے۔ رفیقہ حیات کی رفاقت، بینائی، ملازمت، تشخص اور گھر بار لٹا کر بھی اقبالؔ عظیم کا حوصلہ پست نہیں ہوا۔ وہ مطمئن ہیں کہ کم از کم اب انہیں کسی شے کے لٹ جانے کا کوئی خدشہ تو نہیں ہے۔ وہ مہاجر ضرور ہیں مگر بے گھر نہیں۔ اس لیے کہ سارا وطن ان کا گھر ہے۔ اپنے قارئین کو بھی وہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ میری طرح تم بھی اپنی آنکھ کا دیا بجھا ڈالو۔ اس سے فائدہ یہ ہو گا کہ نہ تمہیں اندھیرے کا ڈر ہو گا اور نہ ہی روشنی چھن جانے کا کوئی خوف۔ اپنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

اپنا سب کچھ لٹ چکا اقبال، لیکن شکر ہے
اب کوئی خوفِ زیاں تو کم سے کم باقی نہیں[۱۲۸]

بجھا لو اپنی آنکھیں جس طرح ہم نے بجھا لی ہیں
نہ خوفِ تیرگی ہو گا، نہ فکرِ روشنی ہو گی[۱۲۹]

یہ لطفِ خاص ہے مجھ پر خدا کا
مہاجر ہوں، مگر بے گھر نہیں ہوں[۱۳۰]

اقبالؔ عظیم کو مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے آنے کے بعد مغربی پاکستان کی ابتر صورت حال کا بخوبی اندازہ تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے المناک سانحے کے بعد ملک کو بے شمار اندرونی و بیرونی چیلنجز کا سامنا رہا۔ عوام بری طرح بد امنی، انتشار، طبقاتی تضادات، فرقہ واریت اور اقتصادی بحران جیسے مسائل میں گھرے ہوئے تھے۔ دوسری جانب سیاسی رہنماؤں کی باہمی چپقلش اور آئے دن مارشل لاء کے نفاذ کی وجہ سے بھی پورے ملک کی فضا پر بے چینی اور خوف و ہراس کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ یہ صورت حال ہر پاکستانی کے لیے مایوس کن تھی۔ اقبالؔ عظیم جیسے محبِ وطن اور حساس شاعر کے لیے بھی یہ سب برداشت کرنا یقیناً تکلیف دہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مایوس نہیں ہوئے۔ انہیں یقین تھا کہ وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔ لہٰذا جلد یہ ظلمتیں چھٹ جائیں گی اور وہ سحر طلوع ہو گی جس کا ہم سب کو انتظار ہے۔ نئی صبح میں طلوع ہونے والا سورج یقیناً پاکستان بھر کے عوام کے لیے امن و آشتی اور ترقی و خوش حالی کی نوید بن کر ابھرے گا۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی اسی رجائی فکر کے ترجمان ہیں:

؎ یہ رات ڈھل کے رہے گی، سحر میں دیر نہیں
نہ جانے کیوں مجھے فردا پہ اعتبار سا ہے
بہت قریب ہے شاید جلوسِ فصلِ بہار
کہ غنچہ غنچہ گلستاں میں بے قرار سا ہے[۱۳۱]

؎ صبح کی پہلی کرن لائے گی پیغامِ حیات
اسی زنداں میں ہے اک روزنِ زنداں اب بھی[۱۳۲]

اقبالؔ عظیم ایک مصلح قوم کی حیثیت سے اپنے ہم وطنوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ وہ مایوس ہونے کی بجائے اپنے حصے کی شمع جلائیں اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ملکی ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔ بقول علامہ اقبالؔ:

؎ آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا[۱۳۳]

اقبالؔ عظیم کے خیال میں بھی اگر اہلیانِ وطن کے ایمان کی چنگاری بھڑک اٹھے اور یہ سب متحد ہو کر ملک کی تقدیر سنوارنے کا عہد کر لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا پیارا وطن ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل نہ ہو اور اسے نقصان پہنچانے والے خود ہی نیست و نابود نہ ہو جائیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں:

؎ عزمِ راسخ کی ضرورت ہے فقط اس کے لیے
تم بدل سکتے ہو نظمِ سحر و شام ابھی
تم اگر چاہو تو جرات کا سہارا لے کر
موڑ سکتے ہو رخِ گردشِ ایام ابھی[۱۳۴]

اقبالؔ عظیم بخوبی جانتے ہیں کہ کسی بھی ملک کی ترقی میں اس کے نوجوان کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو اپنے بلند ارادوں، طاقت، ہنر، اور جرات وولولے کی بنا پر ملک کی تقدیر بدل کر رکھ سکتے ہیں۔ اسی لیے اقبالؔ عظیم کو نوجوانوں سے بے پناہ امیدیں ہیں۔ وہ انہیں ان کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم اسلام اور اپنے اسلاف کی زندہ روایت کے امین ہو۔ لہذا تمہاری ترقی اور کامیابیوں کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ ان کا درج ذیل شعر ان کے انہیں امید افزا ولولہ انگیز خیالات کا عکاس ہے:

؎ تم ہو اک زندۂ جاوید روایت کے چراغ
تم کوئی شام کا سورج ہو کہ ڈھل جاؤ گے[۱۳۵]

اقبالؔ عظیم کا عقیدہ ہے کہ زندگی کی قدریں بے شک تبدیل ہو رہی ہیں، مگر آج بھی اہلِ وفا زمانے سے ناپید نہیں ہوئے۔ آج بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا اخلاق مثالی ہے اور جن کے خلوص و محبت میں کمی نہیں ہے۔ شاید ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے دنیا میں خوب صورتی اور دل کشی ہے:

؎ ہر چند زندگی کی قدریں بدل چکی ہیں
اہلِ وفا سے اب بھی، خالی نہیں زمانہ[۱۳۶]

اقبالؔ عظیم کے مایوس نہ ہونے کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ زندگی سے متعلق ان کا نقطۂ نظر انتہائی واضح اور حقیقت پسندانہ ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ خوشی اور غم ایک دوسرے کے لیے لازم

وملزوم ہیں۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ زندگی میں صرف امن وخوش حالی کا راج ہو تو یہ قانونِ فطرت کے خلاف ہو گا۔ معرکہ خیر وشر ازل سے جاری ہے اور تا ابد جاری رہے گا۔ اس لیے کہ فرات اور کربلا کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس حوالے سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ یہ حسنِ اتفاق ہے یا حسنِ اہتمام
ہے جس جگہ فرات، وہیں کربلا بھی ہے[۱۳۷]
زندگی پر اس سے بہتر تبصرہ ممکن نہیں
ٹھیک دریا کے کنارے ہے زمینِ کربلا[۱۳۸]

اقبالؔ عظیم کا دل حبِ انسانیت سے لبریز ہے۔ وہ دنیا کو امن ومحبت کا گہوارا بنتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے تمام عمر کبھی کسی کے لیے اپنے دل میں کینہ وحسد جیسے منفی جذبات نہیں پیدا ہونے دیے۔ یہاں تک کہ اپنے دشمنوں کو بھی ہمیشہ صدقِ دل سے معاف کر دیا۔ اسی لیے وہ تا عمر خوش اور مطمئن رہے۔ انہوں نے اپنے مثالی کردار، اعلیٰ اخلاق اور پر تاثیر شاعری کے توسط سے دنیا بھر میں امن کی شمع روشن کی:

؎ ہم نگری نگری جاتے ہیں اور گھر گھر گیت سناتے ہیں
ہم گلیوں گلیوں آنگن آنگن پیار کے دیپ جلاتے ہیں[۱۳۹]

اقبالؔ عظیم کے خیال میں ان کی زندگی تمام اہلِ بصارت وبصیرت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ لہٰذا اگر وہ ان کے تجربات سے استفادہ کرنے کی کوشش کریں تو با آسانی منزل پا سکتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی وطن، اہلِ وطن، احباب اور عزیز واقارب سے وفا نبھاتے گزری ہے۔ انہیں اس سے کچھ غرض نہیں کہ اس وفا شعاری کے صلے میں انہیں کیا ملا ہے؟ انہوں نے اپنی زندگی کے بہت سے ایام معذوری چشم کے سبب ظلمت میں بسر کیے ہیں۔ مگر اوروں کے ذہنوں اور دلوں کو علم وآگہی کے نور سے منور کیا۔ اپنے درج ذیل اشعار میں وہ اپنے قارین سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

؎ میں نقوشِ پا سے رستوں کو جلا دے جاؤں گا
میں جو گزروں گا، تو منزل کا پتا دے جاؤں گا
جیسے میں نے زندگی کی ہے، سبھی کو علم ہے

میں زمانے کو وفا کا حوصلہ دے جاؤں گا
کیا دیا دنیا نے مجھ کو، یہ کبھی سوچا نہیں
سوچتا ہوں یہ کہ میں دنیا کو کیا دے جاؤں گا
میں نے گو اقبالؔ، ظلمت میں بسر کی زندگی
آنکھ والوں کو مگر میں آئینہ دے جاؤں گا[۴۰]

بحیثیت مجموعی اقبالؔ عظیم کی غزلیں خودداری و رجائیت کے جذبات سے لبریز ہیں۔ گو ان کی اس نوع کی شاعری اردو ادب کی اسی شعری روایت کا تسلسل ہے، جسے میرؔ، دردؔ، فغاںؔ، غالبؔ، آتشؔ، فراقؔ، فیضؔ اور علامہ اقبالؒ وغیرہ نے پروان چڑھایا، مگر اقبالؔ عظیم کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے زندگی میں بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنے اور ان گنت مسائل سے نبرد آزما رہنے کے باوجود صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ دو بار ہجرت کی اذیت سے دوچار رہے، بینائی جیسی نعمت عظمیٰ سے محروم ہوئے اور اپنے ہی وطن میں غریب الوطن اور مہاجر کہلائے۔ انتہائی مشکل حالات میں بھی انہوں نے کسی کے سامنے نہ ہاتھ پھیلایا اور نہ ہی کسی سے اپنا افسانہ غم کہا۔ انہوں نے ہر حال میں اپنی خودداری کا بھرم قائم رکھا اور ڈٹ کر تلخیوں کا مقابلہ کیا۔ وہ ایک زندہ دل انسان تھے۔ بصارت سے محرومی کے باوجود انہوں نے نہ صرف اپنی زندگی جواں مردی سے بسر کی، بلکہ آنکھ والوں کو بھی جینے کا ہنر سکھایا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی زندگی ایک ایسا چراغ ہے جس کی روشنی میں ہم اپنی منزل کا تعین بھی کر سکتے ہیں اور اس تک پہنچنے کا سراغ بھی پا سکتے ہیں تو بے جا نہ ہو گا۔

حوالہ جات:

۱۔سلام سندیلوی،اردو شاعری میں خودداری(نئی دہلی:انجمن ترقی اردو،۱۹۷۹ء)،ص۹۔

۲۔رابعہ سرفراز،"اقبال اور فیض کی فکر کے رجائی پہلو" مشمولہ نور تحقیق ،شمارہ ۵،(لاہور: گریژن یونی ورسٹی)،ص۱۱۸۔

۳۔خواجہ میر درد،دیوان اردوخواجہ میر درد(دہلی:مطبع انصاری،۱۸۹۲ء)،ص۱۰۔

۴۔ایضاً،ص۲۸۔

۵۔21june 2022,8:30am, https://www.rekhta.org۔

۶۔مرزاغالب،دیوان غالب(کانپور:مطبع نظامی،۱۸۶۲ء)،ص۴۷۔

۷۔ایضاً،ص۵۳۔

۸۔ایضاً،ص۴۲۔

۹۔ایضاً،ص۱۸۔

۱۰۔سلام سندیلوی،اردو شاعری میں خودداری،ص۵۰۔

۱۱۔ایضاً،ص۵۱۔

۱۲۔خواجہ محمد ذکریا،انتخاب زریں اردو غزل(کراچی:سنگت پبلی شر۲۰۰۹ء)،ص۱۰۵۔

۱۳۔ علامہ محمد اقبال،بال جبریل(لاہور:مکتبہ جمال،۲۰۱۲ء)،ص۷۸۱۔

۱۴۔ایضاً،ص۵۸۴۔

۱۵۔علامہ محمد اقبال،بانگ درا(لاہور:مکتبہ جمال،۲۰۱۲ء)،ص۳۳۶۔

۱۶۔افتخار احمد صدیقی،فروغ اقبال(لاہور:سعادت آرٹ پریس،۱۹۹۶ء)،ص۲۸۸۔

۱۷۔علامہ محمد اقبال،بال جبریل،ص۵۴۸۔

۱۸۔ایضاً،۶۳۱۔

۱۹۔ علامہ محمد اقبال،بانگ درا،ص۴۷۹۔

۲۰۔ فیض احمد فیض،نسخہ ہائے وفا(دہلی:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۸۶ء)،ص۲۵۹۔

۲۱۔ ایضاً،ص۱۰۷۔

۲۲۔ ایضاً،ص۱۲۰۔

۲۳۔ فیض،https://www.rekhta.org ,21june 2022,9:10am۔

۲۴۔ ابوالخیر کشفی،"اقبال عظیم کی غزل میں مسلسل ارتقا نظر آتا ہے"،روشنائی،کراچی(۳۰ جولائی تا ستمبر۲۰۰۷ء)،ص۱۵۴۔

۲۵۔ اقبال عظیم،کلیات غزل ماحصل(کراچی:توکل اکیڈمی کاشانہ خلیل،۲۰۱۰ء)،ص۳۷۳۔

۲۶۔ ایضاً،ص۴۷۔

۲۷۔ ایضاً،ص۶۷۔

۲۸۔ ایضاً،ص۲۷۷۔

۲۹۔ ایضاً،ص۹۹۔

۳۰۔ ایضاً،ص۱۰۶۔

۳۱۔ ایضاً،ص۱۳۷۔

۳۲۔ ایضاً،ص۳۰۴۔

۳۳۔ ایضاً،ص۲۱۵۔

۳۴۔ ایضاً،ص۲۴۶۔

۳۵۔ ایضاً،ص۲۶۸۔

۳۶۔ ایضاً،ص۲۴۷۔

۳۷۔ ایضاً،ص۳۱۴۔

۳۸۔ ایضاً،ص۳۹۰۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۹۷۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۳۹۴۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۳۶۷۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۴۳۱۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۴۷۱۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۴۷۲۔

۴۵۔ خواجہ حیدر علی آتش، https://www.rekhta.org, 22june 2022,8:35am۔

۴۶۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۷۶۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۷۶۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۳۶۳۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۳۷۲۔

۵۰۔ ایضاً، ص ۳۹۰۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۷۲۔

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۹۹۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۲۲۵۔

۵۴۔ راقمہ کا شکیل اقبال عظیم سے ٹیلفونک انٹرویو، 23june2022,12:45pm۔

۵۵۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۴۷۔

۵۶۔ ایضاً، ص ۷۶۔

۵۷۔ ایضاً، ص ۲۲۲۔

۵۸۔ ایضاً، ص ۷۲۔

۵۹۔ ایضاً، ص ۷۷۔

۶۰۔ ایضاً، ص ۲۰۴۔

۶۱۔ مرزا غالب، دیوان غالب جدید (بھوپال: مدھیہ پردیس اردو اکیڈمی، ۱۹۸۲ء)، ص ۱۹۷۔

۶۲۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۸۶۔

۶۳۔ فرحت پروین ملک، دربار ادب (ناظم آباد: زین پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ص ۶۷۔

۶۴۔ ایضاً، ص ۷۸۔

۶۵۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۲۲۵۔

۶۶۔ ایضاً، ص ۷۵۔

۶۷۔ ایضاً، ص ۱۳۸۔

۶۸۔ ایضاً، ص ۴۰۳۔

۶۹۔ ایضاً، ص ۳۵۷۔

۷۰۔ ایضاً، ص ۲۹۶۔

۷۱۔ ایضاً، ص ۳۰۱۔

۷۲۔ ایضاً، ص ۳۰۵۔

۷۳۔ ناصر حیات، اقبال عظیم حیات و ادبی خدمات (کراچی: توکل اکیڈمی کاشانہ خلیل، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۴۱۔

۷۴۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۷۴۔

۷۵۔ ایضاً، ص ۱۷۷۔

۷۶۔ سیارہ "لاہور" (اکتوبر تا نومبر ۱۹۸۴ء)، ص ۹۷۔

۷۷۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۱۶۹۔

۷۸۔ ایضاً، ص ۲۴۳۔

۷۹۔ ایضاً، ص ۳۶۲۔

۸۰۔ ایضاً، ص ۴۱۱۔

۸۱۔ ایضاً، ص ۹۰۔

۸۲۔ ایضاً، ص ۹۱۔

۸۳۔ ایضاً، ص ۴۸۰۔

۸۴۔ ایضاً، ص ۱۱۷۔

۸۵۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔

۸۶۔ ایضاً، ص ۴۸۷۔

۸۷۔ ایضاً، ص ۴۰۷۔

۸۸۔ ایضاً، ص ۴۰۷۔

۸۹۔ ایضاً، ص ۱۹۷۔

۹۰۔ ایضاً، ص ۴۰۷۔

۹۱۔ ایضاً، ص ۳۹۳۔

۹۲۔ ایضاً، ص ۱۴۵۔

۹۳۔ ایضاً، ص ۴۹۴۔

۹۴۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔

۹۵۔ ایضاً، ص ۴۸۲۔

۹۶۔ ایضاً، ص ۳۰۸۔

۹۷۔ ایضاً، ص ۳۲۵۔

۹۸۔ ایضاً، ص ۳۶۴۔

۹۹۔ ایضاً، ص ۴۷۵۔

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۲۹۰۔

۱۰۱۔ ایضاً، ص ۳۶۹۔

۱۰۲۔ ایضاً، ص ۴۱۲۔

۱۰۳۔ ہارون رشید، دو ہجرتوں کے اہل قلم (ناظم آباد، احمد برادرز پرنٹرز، ۲۰۱۲ء)، ص ۳۹۔

۱۰۴۔ فرحت پروین ملک، دربار ادب، ص ۸۰۔

۱۰۵۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۴۲۰/۴۲۱۔

۱۰۶۔ فرحت پروین ملک، دربار ادب، ص ۶۷۔

۱۰۷۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۴۲۷۔

۱۰۸۔ ایضاً، ص ۳۸۳۔

۱۰۹۔ ایضاً، ص ۴۷۷۔

۱۱۰۔ ایضاً، ص ۴۸۲۔

۱۱۱۔ روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۴ نومبر ۱۹۸۹۔

۱۱۲۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۷۳۔

۱۱۳۔ ایضاً، ص ۱۱۰۔

۱۱۴۔ ایضاً، ص ۳۶۷۔

۱۱۵۔ ایضاً، ص ۴۱۱۔

۱۱۶۔ ایضاً، ص ۱۱۱۔

۱۱۷۔ خطا معاف یہ کچھ اور ہی حیا تو نہیں۔ www.youtube.com

۱۱۸۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۳۶۸۔

۱۱۹۔ ایضاً، ص ۴۲۰۔

۱۲۰۔ ایضاً، ص ۸۷۔

۱۲۱۔ ایضاً، ص ۱۰۸۔

۱۲۲۔ ایضاً، ص ۱۰۹۔

۱۲۳۔ ایضاً، ص ۳۳۵۔

۱۲۴۔ ایضاً، ص ۱۲۷۔

۱۲۵۔ ایضاً، ص ۱۳۳۔

۱۲۶۔ ایضاً، ص ۲۹۲۔

۱۲۷۔ ایضاً، ص ۳۸۲۔

۱۲۸۔ ایضاً، ص ۲۳۳۔

۱۲۹۔ ایضاً، ص ۳۰۸۔

۱۳۰۔ ایضاً، ص ۴۱۳۔

۱۳۱۔ ایضاً، ص ۱۸۴۔

۱۳۲۔ ایضاً، ص ۲۲۹۔

۱۳۳۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۱۲ء)، ص ۳۵۸۔

۱۳۴۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل، ص ۴۸۶۔

۱۳۵۔ ایضاً، ص ۳۸۲۔

۱۳۶۔ ایضاً، ص ۱۷۰۔

۱۳۷۔ ایضاً، ص ۱۱۳۔

۱۳۸۔ ایضاً، ص ۳۶۰۔

۱۳۹۔ ایضاً، ص ۴۰۳۔

۱۴۰۔ ایضاً، ص ۴۴۳/۴۴۴۔

ماحصل

تقریر و تحریر کے ذریعے اپنے افکار و خیالات اور احساسات و جذبات کا شائستہ اظہار ادب کہلاتا ہے۔ دنیا کے ہر بڑے ادب کی طرح اردو کا ذخیرہ ادب بھی دو حصوں میں منقسم ہے۔ نثر اور نظم۔ نثر کے مقابلے میں شاعری کی اہمیت مسلم ہے۔ اس لیے کہ اس میں اثر پزیری اور سامعین و قارئین کے دلوں پر سحر طاری کرنے کی صلاحیت نثر سے کہیں زیادہ ہے۔ نظم کی بیشتر اصناف مثلاً مخمس، مسدس، رباعی، قطع، مرثیے اور قصیدے وغیرہ کے مقابلے میں غزل کو آج بھی فوقیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ اس کا ہر شعر اپنے آپ میں ایک اکائی ہوتا ہے۔ غزل ہی انسان کے لطیف احساسات و جذبات کی ترجمان ہے اور اسی صنفِ سخن میں کم سے کم الفاظ میں بڑی سے بڑی بات اور اچھوتے سے اچھوتا مضمون بیان کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ صنفِ ادب ابتداً عرب میں پروان چڑھی اور پھر فارسی کے زیرِ اثر اردو میں داخل ہوئی۔ عشق و تصوف، مذہب، فلسفہ، سیاست، معیشت، اور عصرِ حاضر کے مسائل کی ترجمانی غزل کے اہم ترین موضوعات میں شامل ہے۔ ولیؔ، سراجؔ میرؔ، دردؔ، غالبؔ، مومنؔ، ظفرؔ، داغؔ، حالیؔ، فانیؔ، اصغرؔ، جگرؔ، فیض اقبالؔ، فیضؔ، ناصرؔ، منیر نیازی اور اقبالؔ عظیم وغیرہ اردو غزل کے نمائندہ شعرا ہیں۔

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ غزل میں تخیل اور اس کی پیشکش دونوں ہی کی بے پناہ اہمیت ہے۔ تاہم فکر کو بنیادی اور فن کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ پہلے شاعر کے ذہن میں کوئی خیال جنم لیتا ہے اور پھر وہ اسے الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر بیان کرتا ہے۔ فکر کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر پروفیسر اقبالؔ عظیم کی غزلیات کے فکری و موضوعاتی مطالعے کو تحقیقی مقالے کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی کلیات غزل "ماحصل" سے بطور بنیادی ماخذ، جبکہ ان کے بچوں اور عزیزوں سے کیے جانے والے ٹیلیفونک انٹرویوز اور شخصیت اور شاعری سے متعلق تحریر شدہ کتب اور مضامین سے بطور ثانوی ماخذات استفادہ کیا گیا ہے۔ مقالے کی بنیاد درج ذیل سوالات پر رکھی گئی ہے:

اقبالؔ عظیم کی غزلوں کے بنیادی موضوعات کیا ہیں؟

اقبالؔ عظیم کی غزلوں میں مضامینِ درد و غم کی نوعیت کیا ہے؟

اقبالؔ عظیم کی غزل کلاسیکی روایت کی امین ہے یا عصرِ حاضر کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ؟

اقبالؔ عظیم کی غزلیں حزن و یاسیت کا نوحہ ہیں یا خودداری و رجائیت کا پیغام؟

مذکورہ بالا سوالات کی بنیاد پر یہ تحقیقی مقالہ تحریر کیا گیا اور حتی الامکان ان تحقیقی سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یوں تو اقبالؔ عظیم کی غزلوں میں بے پناہ موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے، تاہم عشق و محبت کے لطیف جذبات کی عکاسی، درد و غم کا بیان، سیاسی و سماجی مسائل کی ترجمانی اور خودداری و رجائیت وغیرہ ان کی غزلیات کے بنیادی موضوعات قرار پاسکتے ہیں۔ اقبالؔ عظیم کے ہاں ذاتی و اجتماعی، قومی و ملکی اور سیاسی و سماجی ہر طرح کے غم انتہائی پر درد اور اثر انگیز پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی غزلیات اردو ادب کی صدیوں پر محیط شعری روایت کا تسلسل ہونے کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہیں۔ انہوں نے ولیؔ، میرؔ، غالبؔ، داغؔ، جگرؔ اور اقبالؔ جیسے اساتذہ فکر و فن سے بھرپور اکتساب کیا ہے مگر اپنی غزل کا رشتہ اپنے عہد اور سماج سے بھی قائم رکھا ہے۔ ان کی غزلوں میں اپیل اور اثر پزیری کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری روایت اور عصری شعور کی ترجمانی کا حسین امتزاج ہیں۔ تمام عمر غم و اندوہ سے دوچار رہنے کے باوجود اقبالؔ عظیم مایوسی کا شکار نہیں ہوتے، بلکہ ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ان کا یہی جذبہ ان کی غزلیات میں بھی کار فرماں نظر آتا ہے۔ لہٰذا بحیثیت مجموعی اقبالؔ عظیم کی شاعری حزن و یاسیت کا نوحہ نہیں بلکہ پڑھنے اور سننے والوں کے لیے سر بسر خودداری اور رجائیت کا پیغام ہے۔

عشق و محبت کے لطیف جذبات کا بیان غزل کا بنیادی موضوع ہے۔ ہر شاعر اپنے اپنے انداز میں ان احساسات و جذبات کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر بیان کرتا ہے۔ اقبالؔ عظیم نے بھی اپنی غزلوں کو محبت کی مختلف کیفیات سے مزین کیا ہے۔ اس تحقیقی مقالے کے پہلے باب میں انہیں کیفیات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اقبالؔ عظیم کی غزلیں عشق و محبت کے جذبات سے لبریز ہیں۔ ان میں تغزل، رومانویت، کیفیت نگاری، معاملہ بندی، درد و سوز، یادِ ماضی، احساسِ تنہائی، پاسِ ناموسِ عشق، رقیب پر محبوب کی عنایات کا دکھ، محبوب کی بے رخی، بے وفائی و بے اعتنائی کا گلہ اور سراپا نگاری جیسے تمام پہلو انتہائی دل کش پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔

اقبالؔ عظیم نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا۔ شعر گوئی کا فن انہیں ورثے میں ملا تھا۔ ان کے نانا ادیبؔ میرٹھی، دادا سید فضل عظیم فضلؔ اور والد سید مقبول عظیم عرشؔ سبھی قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے بڑے بھائی سید وقار

عظیم کا شمار بھی اردو ادب کے نامور محققین، ناقدین، نصاب سازوں اور نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے اقبالؔ عظیم کی ذہنی تربیت اردو شاعری کے دو بڑے دبستانوں میں ہوئی۔ دبستانِ دلی کے ذریعے سے بالواسطہ، یعنی بذریعہ مطالعہ اور دبستانِ لکھنؤ سے بلاواسطہ، یعنی براہ راست ملاقاتوں اور صحبتوں کے ذریعے۔ پاکستان آنے سے پہلے ان کی زندگی کا انتہائی اہم حصہ لکھنؤ کے گلی کوچوں میں بسر ہوا۔ جہاں انہوں نے صفیؔ لکھنؤی، آرزوؔ لکھنوی، عصرؔ لکھنوی اور قدیرؔ لکھنوی سے روبرو استفادہ کیا، جگرؔ اور حسرتؔ سے خاص طور پر متاثر رہے اور میرؔ، غالب، مومنؔ اور داغؔ وغیرہ کو اردو ادب کی مقدس روایت کے طور پر پڑھا۔

مشرقی پاکستان ہجرت سے قبل اقبالؔ عظیم اگرچہ عمر کی درمیانی منزلوں سے گزر رہے تھے، تاہم اس وقت تک ان کی زیادہ تر شاعری عشقیہ ہی تھی۔ ان کی رومانوی شاعری میں روایتی موضوعات بھی بیان کیے گئے ہیں اور ذاتی تجربات بھی۔ ان کی غزلوں کے اشعار میں سچے معاملات بھی ہیں اور نازک کیفیات بھی۔ ان کے یہاں جوانی میں ہونے والی محبت اور اس محبت کے نتیجے میں ملنے والے غم کی کسک اور رومانوی تخیل کی رنگینی بھی محسوس ہوتی ہے۔ افسانہ محبت کا خلاصہ کم و بیش وہی ہے جو اردو ادب کے اکثر شعرا کے ہاں عموماً نظر آتا ہے۔ یعنی ایک نفسیاتی رکاوٹ، بہت سے خدشات کے ساتھ محبوب سے محبت کا اظہار، دوسرا یا تیسرا جانب سے محتاط اور خاموش پذیرائی، دونوں جانب جذبات کی فراوانی، عاشق و معشوق جب ایک دوسرے کو اپنی زندگی کا مقصود بنالیں تو خاندانی روایات، معاشرتی رکاوٹوں یا مذاہب و مسالک کے اختلافات کی بنا پر جبری جدائی کا سامنا، کچھ عرصہ ناکامیِ محبت کا ماتم اور پھر تقدیر کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کرلینا۔

اقبالؔ عظیم درد و سوز کو محبت کی خاص عطا سمجھتے ہیں۔ وہ محبوب کے فراق پر نوحہ کناں نہیں ہوتے، بلکہ اس کی یادوں کو سرمایہ زیست خیال کرتے ہوئے اپنے لیے خوشی اور راحت کا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کا مکمل ادراک بھی رکھتے ہیں کہ راہِ عشق کے مسافر کو قدم قدم پر مشکلات اور طوفانوں کا سامنا رہتا ہے۔ لہٰذا وہ انجامِ محبت سے خائف نہیں ہوتے، بلکہ ان رکاوٹوں کو عبور کرنے کا بھرپور حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔

اقبالؔ عظیم کی عشقیہ شاعری میں کیفیت نگاری بھی ہے اور معاملہ بندی بھی۔ کیفیت نگاری کے اعتبار سے وہ جگرؔ اور حسرتؔ جبکہ معاملہ بندی کے اعتبار سے دبستانِ داغؔ کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں معاملے کا لطف الگ ہے اور زبان کا لطف الگ۔ لیکن یہاں اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ اقبالؔ عظیم کی شاعری داغؔ کی شاعری

سے خاصی مختلف ہے۔ اس لیے کہ اگر داغؔ کے ہاں شوخی کا عنصر نمایاں ہے تو اقبالؔ عظیم کی شاعری میں خودداری کا پہلو بدرجہ اتم موجود ہے۔ بیشتر کلاسیکی شعرا کے برعکس اقبالؔ عظیم کے ہاں عشق و محبت کے معاملات میں سپردگی کے مقابلے میں جارحیت کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ گڑگڑا گڑگڑا کر محبوب سے محبت کی بھیک نہیں مانگتے۔ اس لیے کہ انہیں اپنا پندار بے حد عزیز ہے۔

ولیؔ میرؔ، غالبؔ، فیضؔ اور عہدِ حاضر کے بہت سے شعرا کی طرح اقبالؔ عظیم بھی ایک جمال پرست شاعر ہیں اور محبوب کے سراپا کی تعریف والہانہ انداز میں کرتے ہیں۔ مگر پختگی کی عمر کو پہنچ کر ان میں اسی حسن و جمال سے ایک حریفانہ کشاکش بھی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اسے ایک عارضی و ناپائدار شے سمجھنے لگتے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی فکر میں تبدیلی رونما ہوتی ہے اور ان کی شاعری مجاز سے حقیقت کی جانب مراجعت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان کی اس دور کی غزلوں میں قربِ الٰہی اور دیدارِ الٰہی کی خواہش کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ اللہ رب العزت کی محبت اور قرب کے حصول کا سب سے بڑا تقاضا محبوبِ کبریا ﷺ سے والہانہ عشق اور ان کی تعلیمات کی پیروی ہے۔ اقبالؔ عظیم کا دل عشقِ رسول ﷺ سے لبریز ہے۔ یہی محبت انہیں غزل سے نعت گوئی کی جانب لے گئی اور ان کی شاعری کی جان بن گئی۔

اگرچہ اقبالؔ عظیم کو غزل کے مقابلے میں نعت گوئی کی بدولت زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ نعت گوئی میں کمال بھی غزل کی بدولت ہی پیدا ہوا۔ درد و سوز، ہجر و فراق اور وارداتِ قلبی کا اظہار، ان سب کیفیات کا بیان غزل ہی کے مرہونِ منت ہے۔ دوسرا یہ کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کا خلاصہ حبِ انسانیت ہے۔ چنانچہ ان تعلیمات کے پیروکار کی حیثیت سے اقبالؔ عظیم کی غزلیں سربسر محبت ہیں اور ان میں ساری نسلِ انسانی کے لیے امن اور محبت کا پیغام ہے۔

اقبالؔ عظیم کی شاعری میں محبت کے تمام رنگ اور آہنگ اپنے طرزِ اظہار کی خوبیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی غزلیں اردو ادب کی شعری روایت کا تسلسل بھی ہیں اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بھی۔ ان کے ہاں ولیؔ کی جمال پرستی، میرؔ کے درد و غم، دردؔ کے تصوف، غالبؔ و یگانہؔ کی خودداری، آتشؔ کی درویشی، مومنؔ و داغؔ کی معاملہ بندی، جگرؔ کی شوخی اور فیضؔ کی رومانویت کی جھلک واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔

غزل داخلی کرب کے اظہار کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ یہ صنف فارسی کے زیرِ اثر اردو میں داخل ہوئی اور پروان چڑھی۔ لہذا اس کے مزاج کی تشکیل میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی عوامل کے علاوہ تصوف کی روایت کا بھی خاص عمل دخل ہے۔ فارسی شعرا کی پیروی کرتے ہوئے میرؔ، دردؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور ان کے زیرِ اثر اردو کے تقریباً تمام شعرا نے زندگی کے المیہ تجربات کو ایک روحانی اور اخلاقی مفہوم عطا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا اور وحدت الوجود، وحدت الشہود، زندگی کی بے ثباتی، دنیا کی فنا پذیری اور اشیا کی ناپائیداری جیسے موضوعات کو اپنی غزلوں میں بیان کیا۔ متصوفانہ افکار ہی کی بدولت غزل میں سوز و گداز پیدا ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ درد و الم کے بے شمار موضوعات اس میں شامل ہوتے چلے گئے۔ رنج و غم کے مضامین ہمیں اردو ادب کے تقریباً سبھی شعرا کے کلام میں ملتے ہیں۔ اقبالؔ عظیم کی غزلیں بھی اس سے مبرا نہیں ہیں۔ لہذا مقالے کے باب دوم میں اقبالؔ عظیم کی غزلوں میں درد و الم کی وجوہات و محرکات اور نوعیت معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اقبالؔ عظیم کو بچپن سے وفات تک ان گنت مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں کم سنی میں حقیقی والدہ کے انتقال، سوتیلی والدہ کے زیرِ سایہ پرورش، پردیس میں تعلیم و تربیت، والد اور سوتیلی والدہ کی رحلت، سات چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کی ذمہ داری، بے روزگاری، محبت میں ناکامی، بسلسلہ ملازمت دربدری، مشرقی پاکستان ہجرت، غریب الوطنی، بنگالیوں کے ناروا سلوک، اہلیہ کی بیماری اور وفات، تین چھوٹے بچوں کی تن تنہا پرورش کی ذمہ داری، بینائی کے زیاں، مغربی پاکستان ہجرت، سقوط ڈھاکہ کے المیے، عدم شناخت، اجنبیت کے احساس، معاشی تنگ دستی اور فالج کے پے در پے حملوں جیسے آلام و مصائب نے گھیرے رکھا۔ غم واندوہ کی کثرت کسی بھی انسان کو، خواہ وہ کتنا ہی پر عزم اور باحوصلہ ہو نا تڑپا کر رکھ دیتی ہے۔ مذکورہ تکلیف دہ حالات میں اقبالؔ عظیم کا سسکارنا، صدائے احتجاج بلند کرنا اور تلملا اٹھنا فطری ہے۔ اقبالؔ عظیم نے ضبط و احتیاط کے دعووں کے باوجود اپنے اشعار میں دیدہ و دانستہ بہت سے غموں کی نقاب کشائی کر دی ہے۔ وہ زندگی میں پیش آنے والے روح فرسا واقعات اور تلخ تجربات شاعری میں بیان کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ ان کی غزلیں ان کے تلخ تجربات اور اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کی عکاس ہیں۔ ان کی شاعری قارئین کو ان کے رنج و آلام، مجبوریوں اور محرومیوں سے بھرپور آگہی فراہم کرتی ہے۔

غمِ بے نگاہی کے احساس نے اقبالؔ عظیم کی غزلوں کو جو درد اور کسک عطا کی ہے، اس سے ان کے کلام میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے اس نوع کے اشعار میں پڑھنے والوں کو سوز و گداز اور جمالیاتی حسن کے ساتھ ساتھ محرومیوں سے نبرد آزما ہو کر مردانہ وار زندگی جینے کا حوصلہ بھی ملتا ہے۔

ہجرت کا احساس قیامِ پاکستان کے بعد اکثر مہاجر و غیر مہاجر غزل گو شعرا کی غزلوں کا بنیادی موضوع قرار پا سکتا ہے۔ ان میں سے بہت سے شعرا کے یہاں اس احساس نے مہجوری کی صورت اختیار کر لی ہے اور بعد قطع تعلق تک جا پہنچی ہے۔ لیکن ان کے برعکس اقبالؔ عظیم کی ہجرت محض نقل مکانی ہی کا نام نہیں، بلکہ انہوں نے نئے وطن کو درد ہجرت کے ساتھ اپنایا ہے۔ یوں ان کی شاعری میں دردمندی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ تلخی اور صحت مند جدوجہد بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اقبالؔ عظیم کی حزنیہ شاعری میرؔ کے افکار سے متاثر ضرور ہے، مگر ان کے ہاں داخلی کرب کے اظہار میں میرؔ کا سا درد و سوز مفقود ہے۔ وہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون ہونے پر عارضی طور پر رنجیدہ تو ہوتے ہیں، مگر میرؔ کی طرح ہمہ وقت نوحہ کناں نہیں رہتے۔ ان کے ہاں فیضؔ کی طرح رنج و کرب کی دھیمی آنچ میں دھیرے دھیرے سلگنے کا تاثر نہیں ملتا اور نہ ہی ناصرؔ کی سی مستقل اداسی کی گہری چھاپ ان کی غزلوں پر موجود ہے۔ اقبالؔ عظیم کے یہاں فانیؔ کی سی یاسیت بھی نہیں ہے اور نہ ہی وہ موت کو غم سے فرار و نجات کا واحد اور حتمی ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ ان کے کلام کے مزاج پر غالبؔ کی خودداری، اذیت پسندی اور غم سے خوشی کشید کرنے کا عنصر نمایاں ہے۔

دورِ ثانی میں اقبالؔ عظیم علامہ اقبالؒ کے افکار سے سب سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے غم کو مایوسی کا باعث نہیں بننے دیتے، بلکہ اسی جذبے سے زندگی میں حرارت اور جینے کی امنگ پیدا کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی یہ ترغیب دیتے ہیں کہ غم بلاشبہ زندگی کا لازمی جز ہے، مگر "زندگی اشک اور آہ نہیں" لہٰذا انسان کو ہمہ وقت محرومیوں کا رونا نہیں رونا چاہیے۔ اسے جیتے جی نہ تو مایوسی کا شکار ہونا چاہیے اور نہ ہی ہر وقت موت کی تمنا کرتے رہنا چاہیے۔ بلکہ اسے چاہیے کہ زندگی کی اقدار کا آئینہ دار ہے جب تک جیے خودداری کے ساتھ جیے اور تقدیر کے لکھے پر قناعت کرنے کی بجائے خلوصِ نیت اور صدقِ دل سے اسے بدلنے کے لیے عمل پیرا ہو۔

درد و غم کے بیان کے حوالے سے اقبالؔ عظیم کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ محض شعری روایت کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے المیہ مضامین بیان نہیں کرتے، بلکہ شاعری کو زندگی اور سماج کے جملہ مسائل سے منسلک کر کے تخلیقی اظہار کا

ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کا غم اپنے اندر ایک انفرادی کسک لیے ہوئے ہے۔ غم کی یہی کسک اور ٹیس انہیں دیگر شعرا کے تصورہائے غم سے ممتاز کرتی ہے۔

ادب زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق تہذیب و ثقافت سے ہو، سماجی اقدار سے، معیشت و اقتصادیات سے یا سیاسی صورت حال سے۔ ادب، سیاست اور سماج ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ کوئی بھی شاعر یا ادیب نہ تو عصری صورت حال سے بے خبر رہ سکتا ہے اور نہ ہی اس سماج سے کٹ کر رہ سکتا ہے جس کا وہ فرد ہوتا ہے اور جس میں رہ کر وہ پروان چڑھتا اور شعور کی منازل طے کرتا ہے۔ ہر دور میں تخلیق ہونے والا ادب اس عہد کی سیاسی صورت حال اور سماج کا ترجمان ہوتا ہے۔ ادب کے مطالعے سے کسی بھی خطے کی تہذیب و ثقافت، طرزِ معاشرت، اور سیاسی و اقتصادی صورت حال کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ نباضِ قوم کی حیثیت سے شعرا کی اہمیت مسلم ہے۔ وہ اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات سے نہ صرف متاثر ہوتے ہیں، بلکہ اپنی تخلیقات میں ان کی تصویر کشی بھی کرتے ہیں۔ اقبالؔ عظیم کی غزلیں بھی اپنے عہد کی سیاسی و سماجی صورتِ حال کی عکاس ہیں۔ تحقیقی مقالے کے باب سوم میں اقبالؔ عظیم کی غزلوں میں سیاسی و سماجی شعور کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اقبالؔ عظیم کی غزلیں ان کے گہرے سیاسی و سماجی شعور کا پتا دیتی ہیں۔ وہ تقسیمِ ہند کے عینی شاہد تھے اور بخوبی جانتے تھے کہ اس تقسیم کے نتیجے میں کتنے بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، کتنے لوگ زخمی ہوئے، کتنی خواتین کی عصمتیں لٹیں، کتنی لڑکیاں خودکشی پر مجبور ہوئیں، کتنی بیویوں کے سہاگ اجڑے، کتنے معصوم بچے یتیم ہوئے یا نقل مکانی کے دوران والدین سے جدا کر دیے گئے۔ ہجرت کی تلخیوں، سفر کی صعوبتوں اور مہاجرین کیمپوں کی صورت حال بھی ان سے پوشیدہ نہ تھی۔ سسکتی اور بلکتی انسانیت کا دکھ ان کے سینے میں سمٹ کر ان کی ذات کا مستقل حصہ بن گیا۔ غالباً یہی وہ سانحہ تھا جب ان کا ذاتی غم اجتماعی غم میں ضم ہو گیا اور انہیں ساری انسانیت کا دکھ اپنا دکھ محسوس ہونے لگا۔ ان کی غزل پر غمِ انسانیت اور غمِ وطن اس قدر غالب آیا کہ باقی تمام روایتی مضامین پس پشت جا پڑے۔ ان کے آخری دور کی غزلوں پر نظموں کا گمان ہوتا ہے۔ ان کی دورِ ثانی میں تخلیق ہونے والی شاعری بخوبی قومی اصلاح کا فریضہ سرانجام دے رہی ہیں۔ اقبالؔ عظیم نے انیس سو پچاس میں ہندوستان سے مشرقی پاکستان ہجرت کی۔ ہر محبِ وطن پاکستانی کی طرح انہوں نے بھی نئے وطن میں پر امن اور خوش حال زندگی کے بہت سے خواب دیکھے تھے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اقبالؔ عظیم

کے یہ خواب چکناچور ہوتے چلے گئے اور ان کے درد کی شدت میں اضافہ ہونے لگا۔ انہوں نے قیام پاکستان کے بعد کی گھمبیر صورت حال، بے چینی و بے اطمینانی، بے روز گاری، بھوک، افلاس، اقتصادی بحران رشوت، سفارش، سمگلنگ، لوٹ مار، عفت و عصمت کے تقدس کی پامالی، فرقہ واریت، صوبائی عصبیت، نسلی و لسانی تعصبات، جبر و استحصال، مارشل لا کی سختیوں اور بنگالیوں کے غیر بنگالیوں کے لیے نفرت آمیز جذبات کو اپنی غزلوں کا موضوع بنا کر اس پر آشوب دور کی سچی تصویر کشی کی ہے۔

مشرقی پاکستان میں شروع ہی سے صوبائی و لسانی عصبیت کا جو زہر گھول دیا گیا تھا وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کے عوام کے رگ و پے میں سرائیت کرتا چلا گیا۔ ہندوستان سے مشرقی پاکستان ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کو غیر بنگالی ہونے کی پاداش میں قدم قدم پر بنگالیوں کے ناروا سلوک کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں مشرقی پاکستان کا شہری تسلیم کرنے کی بجائے ہمیشہ مہاجر ہی سمجھا گیا۔ اقبال عظیم جیسے حساس شاعر اس صورت حال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ انہوں نے اپنی غزلیات میں اس دور کے سیاسی و سماجی مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

انہوں نے سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب و محرکات پر بھی غیر جانب دارانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ان کے نزدیک اس سانحے کے اصل ذمہ دار وہ نا اہل سیاسی و عسکری قائدین ہیں جنہوں نے اپنی نا اہلی، بے حسی اور ناپاک عزائم کی بنا پر وطنِ عزیز کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچایا اور تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔ اقبال عظیم نے اپنی غزلوں میں ملکی مسائل پر بھرپور اظہارِ خیال کیا ہے، سیاسی رہنماؤں کی ملک دشمن پالیسیوں پر بے لاگ تنقید کی ہے اور ان جابر حکمرانوں کے طرزِ حکومت کے خلاف بھرپور احتجاج بھی کیا ہے

اقبال عظیم کو مشرقی پاکستان سے بے حد محبت تھی۔ ان کی زندگی کے تقریباً بیس سال اسی سرزمین میں بسر ہوئے تھے۔ انہوں نے بحیثیت معلم، محقق، مدون، مترجم، نصاب ساز اور شاعر مشرقی پاکستان کی ترقی کے لیے بہت سی علمی و تحقیقی اور ادبی و سماجی خدمات سرانجام دیں، مگر ان کی ان خدمات کو فراموش کر دیا گیا اور ان کے لیے زندگی اس قدر دوبھر کر دی گئی کہ انہیں نہ چاہتے ہوئے بھی دوسری ہجرت اور ترکِ وطن کی اذیت سے دوچار ہونا پڑا۔

اقبال عظیم کا خیال تھا کہ پاکستان میں بنگالی و غیر بنگالی کا جھگڑا نہیں ہو گا۔ یہاں سب مسلمان اور پاکستانی کہلائیں گے۔ انہیں بھی پاکستانی شہری کی حیثیت سے تمام حقوق حاصل ہوں گے اور اب کم از کم انہیں کوئی مہاجر نہیں سمجھے گا۔

مگر ان کی امیدیں اب کی بار بھی پوری نہ ہوئیں۔ اس لیے کہ یہاں بھی انہیں عدم تشخص کا شکار ہونا پڑا اور مہاجر ہی کا درجہ دیا گیا۔

اقبال عظیم کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ باقی مہاجر شعرا کی طرح اداسی اور یاسیت خود پر طاری نہیں کرتے، بلکہ ان میں مزاحمت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حبیب جالب اور فیض احمد فیض کی طرح ظلم و جبر کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس دور کی شاعری کو کافی حد تک انقلابی شاعری قرار دیا جا سکتا ہے۔

اقبال عظیم مارشل لاء کے ادوار میں بھی خاموش نہیں رہتے، بلکہ اظہار و ابلاغ پر پابندیاں عائد ہونے کی صورت میں زیادہ فعال ہو جاتے ہیں اور اپنی شاعری کے ذریعے جابر حکمرانوں کی عوام اور ملک دشمن پالیسیوں پر کھل کر تنقید کرتے ہیں۔ وہ اپنی غزلوں کے توسط سے اپنے ہم وطنوں میں جائز حقوق حاصل کرنے کی تحریک بھی پیدا کرتے ہیں اور انہیں سیاسی و عسکری رہنماؤں کی منفی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔

اقبال عظیم نے اپنے معاشرے میں رائج منفی اقدار کی مزاحمت بھی کی ہے اور ایک مصلح قوم کی حیثیت سے اپنے ہم وطنوں کو مثبت رویہ ہائے حیات اختیار کرنے کی ترغیب بھی دی ہے۔ انہیں معاشرے میں ناانصافی، عدم مساوات، فرقہ واریت، نسلی و لسانی تعصبات، باہمی رنجشوں، بغض و حسد، لوٹ مار، قتل و غارت، فتنہ و فساد اور اور دوسروں کے آگے جھکنے اور ہاتھ پھیلانے سے سخت نفرت ہے۔ وہ ایک پر امن معاشرے کے خواہاں ہیں۔ جہاں سب متحد ہو کر باہمی محبت اور رواداری کو فروغ دیں۔ جہاں سب کو برابری کی سطح پر انصاف اور زندگی کی بنیادی سہولیات میسر ہوں، اور جہاں سب اپنی زندگیاں اسلام کے زریں اصولوں کے مطابق بسر کرتے ہوئے ملک و ملت کی ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔

ان کی شاعری میں جو تاثر اور جاذبیت ہے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات و واقعات سے قریبی تعلق رکھتی ہے۔ ان کے کلام میں ان کے عہد کی سیاسی و سماجی صورت حال کا عکس بھی ہے اور اس صورت حال کے حوالے سے اس دور کے انسان کا ردِ عمل بھی۔ یہ تمام حقائق اس بات کی دلیل ہیں کہ اقبال عظیم کی غزلیں اپنے عہد کے سیاسی و سماجی شعور کی عکاس ہیں۔

کسی بھی فرد یا قوم کی ترقی و خوش حالی کے لیے اس کا غیور و خوددار ہونا بے حد ضروری ہے۔ عزتِ نفس کے پاس ہی کی بدولت اسے دنیا میں رفعت و عظمت نصیب ہوتی ہے۔ یہی جذبہ اسے جھکنے اور دوسروں کا دست نگر بننے سے محفوظ

رکھتا ہے۔ خوددار فرد اللہ پر کامل بھروسا رکھتا ہے۔ یوں اس میں رجائیت کا عنصر اس قدر نمایاں ہو جاتا ہے کہ وہ مایوسی کے اندھیروں میں بھی امید کی کوئی نہ کوئی کرن ضرور تلاش کر لیتا ہے۔ اقبالؔ عظیم کا شمار بھی ایسے ہی شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے تمام عمر آلام و مصائب کا سامنا کیا، مگر خودداری اور غیرت مندی کو اپنا شعار بنائے رکھا اور کبھی کسی کا احسان گوارا نہیں کیا۔ انہیں اپنے رب پر کامل بھروسا ہے، اسی لیے نہ وہ خود اس کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنے قاری کو قنوطیت کا شکار ہونے دیتے ہیں۔ مقالے کے باب چہارم میں اقبالؔ عظیم کے کلام میں خودداری و رجائیت کے عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

عشق و محبت کے لطیف جذبات کے اظہار کا معاملہ ہو یا خود پر گزرنے والی غم انگیز کیفیات کا بیان، معذوریٔ چشم کے سبب ملنے والی تکالیف کی بات ہو یا مالی مشکلات کا ذکر، دورانِ ہجرت سفر کی صعوبتوں کا تذکرہ ہو یا طبقہ اشرافیہ کی بے حسی کی داستان، صبر و ضبط اور خودداری کا دامن کبھی اقبالؔ عظیم کے ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا۔ اگر اسی جذبہ خودداری کو اقبالؔ عظیم کی شاعری کی جان قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یوں تو اردو ادب میں حوصلہ مندی کی روایت ہمیں دردؔ، میرؔ، غالبؔ، یگانہ آتشؔ، اقبالؔ، فیضؔ، قرارؔ نوری صہباؔ اختر اور پیرزادہ قاسمؔ وغیرہ کے ہاں بھی ملتی ہے۔ مگر اقبالؔ عظیم کا انداز قدماء، اپنے ہم عصر اور بعد میں آنے والے شعرا سے خاصا منفرد ہے۔

اقبالؔ عظیم کی عشقیہ شاعری میں پندارِ محبت کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ اسی لیے ان کے ہاں خودداری اور صبر و ضبط کے پہلو دیگر شعرا کے مقابلے میں نمایاں ہیں۔ اقبالؔ عظیم محبوب سے محبت اور نظرِ کرم کی بھیک نہیں مانگتے۔ ان کے نزدیک اگر محبوب کو عاشق کی محبت پر بھروسا نہ ہو تو اس سے تعلقات استوار ہی نہیں رکھنے چاہئیں۔ اقبالؔ عظیم ترکِ تمنا کو عرضِ تمنا پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ محبوب سے حالِ دل کہنا اپنے لیے کسرِ شان خیال کرتے ہیں۔

اقبالؔ عظیم اپنے محبوب سے والہانہ محبت کرتے ہیں، مگر اسے وقتاً فوقتاً یہ باور بھی کرا دیتے ہیں کہ وہ اسے بھلا دینے کا بھرپور حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ وہ بھی غالب کی طرح محبوب کے ناز نہیں اٹھاتے۔ نہ ہی اسے روز روز مناتے ہیں۔ اس لیے کہ اس سے ان کی انا کی توہین ہوتی ہے اور ان کی سبک سری کا پہلو نکل سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ کہیں محبوب اس بات کا خوگر نہ ہو جائے کہ اسے روز منایا جائے۔

اقبالؔ عظیم اپنے محبوب کی نشیلی آنکھوں، روشن چہرے، خم دار زلفوں اور خوب صورت چال وغیرہ کی تعریف تو کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی دلاتے ہیں کہ یہ حسن و جمال سورج کی طرح عارضی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماند پڑ جائے گا۔ لہٰذا اس پر تکبر نہیں کرنا چاہیے۔ اقبالؔ عظیم کو اپنی انا عشق سے زیادہ عزیز ہے۔ اگر انہیں ان دونوں جذبات میں سے کسی ایک کا چناؤ کرنا پڑے تو ان کا انتخاب یقیناً انا ہو گی۔

اقبالؔ عظیم بجا طور پر ایک جرات مند انسان ہیں۔ انہوں نے جواں مردی سے زندگی میں پیش آنے والے تلخ تجربات اور الم ناک سانحات کا مقابلہ کیا اور کبھی صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ انہوں نے کبھی اپنے غموں کی تشہیر نہیں کی اور نہ ہی کسی سے مسیحائی کی امید رکھی۔ اس ضمن میں ان کے ضبط کا عالم یہ ہے کہ وہ آنسو تک آنکھوں سے بہنے نہیں دیتے کہ کہیں ان کا فسانہ دل کسی پر عیاں نہ ہو جائے۔ غمِ دوراں، غمِ جاناں، غمِ بے نگاہی، غمِ ہجرت، غرض یہ کہ انہوں نے کسی ایک بھی غم کو اپنی مجبوری یا کمزوری نہیں بننے دیا۔ انہوں نے عزم و ہمت اور فراخ حوصلگی سے ان تمام مسائل کا نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ انہیں شکستِ فاش بھی دی۔ ان کے اشعار میں ان کی خودداری، عزتِ نفس کے پاس اور رجائیت کی جھلک واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔

اقبالؔ عظیم نے پاکستان ہجرت کے بعد انتہائی کسم پرسی کے عالم میں تقریباً تیس برس گزارے۔ محض چار سو تینتیس روپے پچاس پیسے کی پینشن پر گزر بسر کرتے رہے۔ انہوں نے حکومتِ وقت سے کئی بار اس میں اضافے کی درخواست کی، مگر شنوائی نہ ہوئی۔ اس کے باوجود انہوں نے کسی سے اپنی مالی تنگ دستی کا ذکر کیا، نہ امداد کے لیے دستِ سوال دراز کیا۔ وہ گدایانہ طرزِ حیات کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اللہ سے رزق میں کشادگی کی دعا کی اور اپنے قارئین کو بھی رزاقِ حقیقی ہی سے اشیائے ضروریہ طلب کرنے کی تلقین کی۔

اقبالؔ عظیم ایک درویش منش انسان تھے۔ وہ فقیری کو بادشاہی پر فوقیت دیتے تھے۔ انہیں اہلِ ثروت کی دولت اور عہدوں سے کچھ غرض نہ تھی۔ وہ نہ کبھی کسی کی عارضی شان و شوکت سے مرعوب ہوئے، نہ جاہ و منصب کا لالچ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کی خوشامد کی اور نہ ہی کسی کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے اس کا قصیدہ لکھا۔

اقبالؔ عظیم اپنی قوم کو جھوٹے خداؤں سے ڈرنے کی بجائے اللہ رب العزت سے خائف ہونے اور اسی کے آگے سر جھکانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو بار بار اپنے اشعار میں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ انہیں ناخداؤں پر نہیں،

بلکہ خدائے حقیقی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ناخدائی کا دعویٰ کرنے والے یہ رہنما خود اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے اور ہر معاملے میں قادرِ مطلق کے محتاج ہیں تو پھر ان کے سہارے سفینہ قوم کیسے پار لگ سکتا ہے؟

اقبالؔ عظیم کی زندگی اور شاعری اہلِ بصارت و بصیرت کے لیے ایک مثال ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی ظلمت میں گزاری، مگر دوسروں کی زندگی میں علم و آگہی کی شمع روشن کی اور انہیں جینے کا قرینہ سکھایا۔ اگر ان کے تجربات سے استفادہ کیا جائے تو ان کی روشنی میں با آسانی منزل تک رسائی ہو سکتی ہے۔

اقبالؔ عظیم کی اس نوع کی عشقیہ شاعری ہمیں غالبؔ کے زیادہ قریب محسوس ہوتی ہے۔ حسن سے حریفانہ کشاکش کے اعتبار سے وہ یگانہ کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں۔ فقر و درویشی کے حوالے سے دردؔ اور آتشؔ سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں اور قومی و ملی خودداری کے معاملے میں ان کے کلام پر علامہ اقبالؒ کے افکارِ عالیہ کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

غرض یہ کہ اقبالؔ عظیم کی غزلیات اردو ادب کی اسی شعری روایت کا تسلسل ہیں جس کے ابتدائی نمونے ہمیں امیر خسروؔ کے ہاں ملتے ہیں اور جسے ولیؔ، سراجؔ، میرؔ، دردؔ، غالبؔ، مومنؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، داغؔ، اور جگرؔ، وغیرہ نے پروان چڑھایا۔ روایت سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری جدید تقاضوں سے ہم آہنگ اور عصرِ حاضر کے مسائل کی ترجمان بھی ہیں۔ اقبال عظیم کی غزلوں میں ان کے ذاتی غموں اور قومی و ملکی المیوں کا پر درد اظہار ضرور ملتا ہے، مگر بحیثیت مجموعی ان کے کلام پر خودداری اور رجائیت کی گہری چھاپ موجود ہے۔ اس لیے ہم اسے حزن و یاسیت کا نوحہ نہیں قرار دے سکتے۔ ان کی شاعری قارئین کے لیے امن، محبت، خودداری اور امید کا پیغام ہے۔

کتابیات:

آسی، عبدالباری۔کلیات نظیر اکبر آبادی۔لاہور: مکتبہ شعر وادب، ۱۹۸۶ء۔

اجمل، دلشاد۔حبیب جالب ادبی خدمات ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد، س۔ن۔

ایلیا، جون۔شاید۔کراچی: ایلیا اکادمی، ۱۹۹۰ء۔

احمد بٹ، محمد بشیر۔شرح دیوان غالب۔لاہور: اردو بازار، ۲۰۰۲ء۔

احمد، نبی۔اردو غزل میں ہجرت کا تجربہ پی ایچ ڈی۔وفاقی اردو یونی ورسٹی برائے فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی، اسلام آباد، س۔ن۔

اقبال، علامہ محمد۔بال جبریل۔لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۱۲ء۔

اقبال، علامہ محمد۔بانگ درا۔لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۱۲ء۔

اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال۔لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۱۲ء۔

اقبال، نفیس۔اردو شاعری میں تصوف میر: سودا اور درد کے عہد میں۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء۔

اللہ، عنایت۔ہماری شکست کی کہانی۔لاہور: حکایت پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء۔

مترجم ڈاکٹر شیر از دستی۔لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء۔tragedy of errors الدین، کمال متین۔

الحق، شمس۔پیمانے غزل۔کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۸ء۔

الدین ہاشمی، رفیع۔اصناف ادب۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

القرآن، سورۃ القلم۔پارہ ۲۹، آیت نمبر ۴۔لاہور: تاج قرآن مجید اردو بازار۔س۔ن۔

بتول، ماریہ۔غیر افسانوی ادب میں سقوط ڈھاکہ کی عکاسی ایم ایس اردو۔بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۹ء۔

بریلوی، عبادت، جدید شاعری۔کراچی: اردو دنیا حسن منزل، ۱۹۶۱ء۔

تونسوی، طاہر۔فیض کی تخلیقی شخصیت۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، س۔ن۔

جالب، حبیب۔کلیات حبیب جالب۔لاہور:ماورا پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء۔

جالندھری، حفیظ۔کلیات حفیظ جالندھری مرتبہ خواجہ محمد ذکریا۔ نئی دہلی: فرید بک ڈپو، ۲۰۰۸ء۔

حسنین زیدی، نظیر۔شخصیت و مباحث۔کراچی: مکتبہ مسعود، ۱۹۸۳ء۔

حسین، ممتاز۔خیر البشر کے حضور میں۔لاہور: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۷۵ء۔

حیات، ناصر۔اقبال عظیم حیات و ادبی خدمات۔کراچی: توکل اکیڈمی کاشانہ خلیل، ۲۰۱۲ء۔

خان غالب، اسد اللہ۔دیوان غالب مرتبہ صفدر حسین۔لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۰ء۔

خان، حامد علی۔دیوان غالب۔لاہور: مجلس یادگار غالب پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۶۹ء۔

رشید، ہارون۔دو ہجرتوں کے اہل قلم۔ناظم آباد، احمد برادرز پرنٹرز، ۲۰۱۲ء۔

رضوی، حسن۔ناصر کاظمی شخصیت اور فن۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء۔

سالک، صدیق۔میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا۔لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۱۷ء۔

سالک، عبدالمجید۔مسلم ثقافت ہندوستان میں۔لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۵۷ء۔

سدید، انور۔اردو ادب کی تحریکیں۔کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۳ء۔

سکسینہ، رام بابو۔تاریخ ادب اردو مع تعلیقات۔لاہور: جوہر رحمانیہ پرنٹر، ۲۰۱۴ء۔

سندیلوی، سلام۔اردو شاعری میں خودداری۔ نئی دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۹ء۔

سہیل، عامر، عابد، قاضی (مرتبین) اردو کے نمائندہ کلاسیکی غزل گو۔ملتان: اقبال پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۲ء۔

شہاب، قدرت اللہ۔شہاب نامہ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔

صدیقی، افتخار احمد۔فروغ اقبال۔لاہور: سعادت آرٹ پریس، ۱۹۹۶ء۔

عبدالغفار، قاضی۔کلیات فانی۔دکن: عبدالحق اکیڈمی، ۱۹۴۶ء۔

عبدالواحد، جمال۔غیر متداول کلام غالب۔ نئی دہلی: غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین، ۲۰۱۶ء۔

عزیز، قطب الدین۔خون اور آنسوؤں کا دریا مترجمین سلیم منصور خالد، ظہور احمد قریشی۔لاہور: دی میسج پریس، ۲۰۱۷ء۔

عظیم، اقبال۔کلیات غزل ماحصل۔کراچی: توکل اکیڈمی کاشانہ خلیل، ۲۰۱۰ء۔

علی، امتیاز۔فیض صاحب شخصیت اور شاعری۔لاہور: اردو بازار، ۱۹۹۳ء۔

غالب، مرزا۔دیوان غالب جدید۔بھوپال: مدھیہ پردیس اردو اکیڈمی، ۱۹۸۲ء۔

غالب، مرزا۔دیوان غالب۔کانپور: مطبع نظامی، ۱۸۶۲ء۔

فیض، فیض احمد۔دست صبا۔علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۲ء۔

فیض، فیض احمد۔نسخہ ہائے وفا۔دہلی: ایجوکیشنل ہاؤس، ۲۰۰۵ء۔

قاسمی، ناہید۔ناصر کاظمی شخصیت اور فن۔لاہور: فضل حق اینڈ سنز، ۱۹۹۰ء۔

کاشمیری، تبسم۔اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ تک۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، س۔ن۔

کاظمی، ناصر۔دیوان۔لاہور: مکتبہ خیال، ۱۹۹۷ء۔

کاظمی، ناصر۔برگ نے۔لاہور: مکتبہ خیال، ۱۹۸۷ء۔

کاظمی، ناصر۔انتخاب میر۔نصرت پریس، ۱۹۸۷ء۔

گل، محمد جاوید۔ناصر کاظمی اور میر تقی میر کی ذہنی اور فکری مماثلتیں ایم فل۔علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء۔

گوریجہ، رشید احمد۔اردو میں تاریخ ناول۔لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۴ء۔

محمود، صفدر۔پاکستان تاریخ و سیاست۔لاہور: جنگ پبلیشرز، ۱۹۹۰ء۔

ملک، فرحت پروین۔دربار ادب۔ناظم آباد: زین پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء۔

موہانی، حسرت۔دیوان حسرت۔لاہور: خیام پبلی شرز، ۱۹۸۷ء۔

میر، تقی میر۔کلیات میر۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء۔

میر، تقی میر۔کلیات میر مرتبہ کلب علی خان فائق۔لاہور: مجلس ترقی ادب، س۔ن۔

میر درد، خواجہ۔دیوان درد مرتبہ ظہیر احمد صدیقی۔دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۶۳ء۔
میر درد، خواجہ۔دیوان اردو خواجہ میر درد۔دہلی: مطبع انصاری، ۱۸۹۲ء۔
ہاشمی، حمید اللہ۔شرح بانگ درا۔جہلم: پرنٹرز پبلی شر اینڈ بک سلرز، ۲۰۱۷ء۔
ہاشمی، نور الحسن۔کلیات ولی۔لاہور: زاہد پرنٹرز، ۱۹۹۶ء۔

رسائل:

اقبال، شاہین۔"میرے والد محترم کی زندگی کے چند پہلو" رسالہ روشنائی، کراچی (۳۰ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷)۔
سرور، آل احمد۔"اردو ادب میں جذبہ آزادی" مشمولہ شاعر (س۔ن۔)۔
سرفراز، رابعہ۔"اقبال اور فیض کی فکر کے رجائی پہلو" مشمولہ نور تحقیق، شمارہ ۵، (لاہور: گریژن یونی ورسٹی)۔
صدیقی، نذیر احمد "اقبال عظیم" مشمولہ روشنائی، جلد ۸، ۷۔۳۰ کراچی (جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷)۔
عظیم، سید وقار۔"اسے میں تمھاری غزل کا بہت بڑا شاہکار سمجھتا ہوں" مشمولہ روشنائی۔۳۰ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷۔
کشفی، ابوالخیر۔"ثنائے خواجہ اور اقبال عظیم" مشمولہ روشنائی، کراچی (۳۰ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷)۔
کشفی، ابوالخیر۔"اقبال عظیم کی غزل میں مسلسل ارتقا نظر آتا ہے" رسالہ روشنائی، کراچی (۳۰ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء)۔
ملک، فرحت پروین۔"ایک دن ہم بھی بہت یاد کیے جائیں گے" مشمولہ روشنائی، شمارہ ۲۵، کراچی (اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۵ء)۔

ویب سائٹ:

فیض، 21june 2022,9:10am, https://www.rekhta. org
حیدر علی آتش، 22june 2022,8:40am, https://www.rekhta.org خواجہ
خطا معاف یہ کچھ اور ہے حیا تو نہیں، www.youtube.com

مزمل حسین، معاصر سیاسی و سماجی صورت حال میں شاعر اور ادیب کا کردار،

,8:51am,20june2022http://www.tajziat.com/article/10572

مرزا مظہر جان جاناں، http://www.rekhta.com

20june2022,12:54pm

اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر (آغاز سے ۱۸۵۷ء تک)، http://www.ur.wikipedia.org

20june2022,1:10pm

محمد خرم، ادب اور سیاسی شعور، http://alhamd.aiu.edu.pk

20june2022,1:20pm

شمیم حنفی، غالب کا طرز احساس اور سماجی شعور کا مسئلہ، http://www.rekhta.org

20june2022,1:25pm

اکبر الہ آبادی، http://www.rekhta.org

20june2022,1:35pm

گوپی چند نارنگ، شعر حسرت کی سیاسی جہات پر ایک نظر، http://www.rekhta.org

20june2022,1:40pm

نصیر ترابی، http://www.rekhta.org

20june2022,1:50pm.

زین سہیل، سقوط ڈھاکہ اور ہم، http://www.humsub.com.pk

24june2022,11:35am

، صدام حسین، "کتھارسز، نفسیاتی صحت کے لیے" www.facebook.com ۲۰۲۲ مئی ۱۵،

am ۱۰:۳۰

اکرام الحق، "ادب میں المیہ" www.muqalma.com، ۲۰۲۲pm ۱:۰۰ مئی ۲۱،

بقول ابن انشا،www.wekipedia.com

فرزانہ اعظم لطفی، "مرزا اسد اللہ خان غالب کے غم نامے اور دردنامے کا تحقیقی جائزہ"، ۱۰:۱۱am،

۲۰۲۲،جون۹http://www.urdu.links.com

فیض، ۲۰۲۲ مئی ۱۲، ۱:۱۵http://www.rekhta.com

ناصر کاظمی، ۲۰۲۲جون، ۱:۲۰۔http://www.rekhta.com،

ارشد محمود ناشاد، "اسد اللہ خان غالب"https://www.facebook.com ۱دسمبر ۲۰۲۰ء، ۹:۲۰pm۔

یاس یگانہ چنگیزی،http://www.rekhta.org، ۲۴جنوری ۲۰۲۱ء، ۹:۴۴pm

ضمیمہ جات

تعارف شاعر

پیدائش: میرٹھ (یوپی) ۸ جولائی ۱۹۱۳ء

آبائی وطن: قصبہ انبہٹہ ضلع سہارن پور

تربیتی ماحول: لکھنؤ اور اودھ کی گلیاں

تعلیم:

- بی۔اے ۱۹۳۴ء لکھنؤ یونی ورسٹی
- ایم۔اے ۱۹۴۳ء آگرہ یونی ورسٹی
- ریسرچ اسکالر ۵۲۔۱۹۵۱ء ڈھاکہ یونی ورسٹی
- سندِ معلمی ۱۹۳۵ء ٹیچرس ٹریننگ کالج لکھنؤ
- خصوصی امتحانات، ہندی اور بنگلا

ملازمت:

۱۔ معلم سرکاری مدارس، محکمہ تعلیم حکومت یو۔پی مارچ ۱۹۳۹ء تا جولائی ۱۹۵۰ء۔

۲۔ پروفیسر اور صدر شعبہ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج ڈھاکہ اور چاٹگام، اگست ۱۹۵۰ء تا اپریل ۱۹۷۰ء۔

۳۔ ریسرچ آفیسر (عارضیاً) صوبائی سیکریٹیریٹ مشرقی پاکستان جولائی ۱۹۶۶ء تا اپریل ۱۹۷۰ء۔[۱]

تصنیف و تالیف:

۱۔مشرقی بنگال میں اردو (لسانی و ادبی تذکرہ)

۲۔مضراب (غزلوں کا پہلا مجموعہ)

۳۔قَاب قَوسین (نعتوں کا مجموعہ)

۴۔دیوان ۔ ناطق لکھنوی (ترتیب و تدوین اشاعت)

۵۔سات ستارے (پاکستان کے ساتھ معماروں کی سوانح حیات)

۶۔مضراب و رباب (غزلوں کا دوسرا مجموعہ)

۷۔مشرق (مشرقی پاکستان سے متعلق مضامین کا مجموعہ)

۸۔ماحَصَل (کلیات)

۹۔لب کشا (نعتیں، غزلیں)

۱۰۔نادیدہ (غزلیں)

۱۱۔اقبال عظیم (شخصیت، منتخب اشعار)

۱۲۔چراغِ آخرِ شب (غزلوں کو مجموعہ)

۱۳۔زبورِ حرم (کلیات نعت)[۲]

حوالہ جات:

۱۔ اقبال عظیم، کلیات غزل ماحصل (کراچی: توکل اکیڈمی کاشانہ خلیل، ۲۰۱۰ء)، ص ۵۱۱۔

۲۔ ایضاً، ص ۵۱۲۔